حبیب الفتاوی

جدید ترتیب، تعلیق وتخریج

تالیف

حبیب الامت عارف باللہ

حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب قاسمی دامت برکاتہم

شیخ الحدیث وصدر مفتی، بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مہذب پور، سنجر پور، اعظم گڑھ یوپی

خلیفہ ومجاز بیعت

حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی وحضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری

حبیب الفتاویٰ

(جلد نہم)

تالیف:

حبیب الامت، عارف باللہ

حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب قاسمی دامت برکاتہم

شیخ الحدیث وصدر مفتی

بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ دار العلوم مہذب پور، سنجر پور، اعظم گڈھ، یوپی، انڈیا

ناشر

مکتبہ حبیب الامت

جامعہ اسلامیہ دار العلوم مہذب پور

پوسٹ سنجر پور، ضلع اعظم گڈھ، یوپی، انڈیا

نام کتاب: حبیب الفتاوی (جلد نہم)

مصنف: حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب قاسمی دامت برکاتہم

صفحات: 344

تعداد اشاعت: گیارہ سو

قیمت: 350

ناشر: مکتبہ حبیب الامت، جامعہ اسلامیہ دار العلوم مہذب پور
پوسٹ سنجر پور، ضلع اعظم گڈھ، یوپی، انڈیا

رابطہ نمبر: +91-9450546400
+91-7054136788

ملنے کے پتے

۱- مکتبہ حبیب الامت جامعہ اسلامیہ دار العلوم مہذب پور، سنجر پور، اعظم گڈھ، یوپی

۲- مکتبہ طیبہ دیوبند، سہارنپور

فہرست مضامین

☆☆☆

فقہ اور فتاویٰ کی اہمیت اور اس کی تاریخی ضرورت

مفتی حبیب قاسمی

فقہ و فتاویٰ، دینِ اسلام کے وہ مظاہر ہیں جن پر ہر مسلمان کے انفرادی اور اجتماعی معاملات کی بنیاد قائم ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں رہنمائی کی ضرورت نہ ہو، اور یہی رہنمائی فقہ و فتاویٰ کے ذریعے امت کو مہیا کی گئی۔ ہر زمانے میں مسلمانوں نے فقہ و فتاویٰ کی اہمیت کو محسوس کیا اور اپنی زندگیوں کو ان اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔

عہدِ رسالت اور فتاویٰ کی بنیاد

نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں فقہ و فتاویٰ کے ابتدائی نقوش واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ جب بھی صحابۂ کرام کو کسی مسئلہ میں اشکال ہوتا، وہ براہِ راست حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر رہنمائی حاصل کر لیتے تھے۔ آپ ﷺ نے قرآن و سنت کی روشنی میں ان کے تمام سوالات کا جواب دیا اور ایسے اصول و ضوابط عطا کیے جو قیامت تک امت کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

عہدِ صحابہ و تابعین اور فقہی ارتقاء

نبی اکرم ﷺ کے وصال کے بعد صحابہ کرام اور صحابیات نے امت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ خاص طور پر وہ صحابہ جو فقہ و فتاویٰ میں مہارت رکھتے تھے، ان کے پاس لوگ دور دراز سے مسائل کے حل کے لیے آتے تھے۔ جیسے جیسے امت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، مسائل بھی زیادہ پیچیدہ ہونے لگے، اور ان کے حل کے لیے گہرے علم و فہم کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

ائمہ مجتہدین کی آمد اور فقہ کی تدوین

اللہ تعالیٰ نے اس وقت امت کی رہنمائی کے لیے ائمہ مجتہدین کو پیدا فرمایا جنہوں نے قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کی روشنی میں اصولِ فقہ مرتب کیے۔ ان ائمہ کرام نے اجتہاد کے ذریعے ان اصولوں کو عملی شکل دی اور امت کے لیے ایسے مسائل کا استنباط کیا جو قیامت تک کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنے۔ یہ علمی خزانہ امت کے لیے ایک عظیم نعمت ہے۔

اجتہاد کا تسلسل اور موجودہ دور کی ضرورت

اگرچہ اجتہادِ مطلق کا دروازہ بند ہو گیا، لیکن تطبیقی اجتہاد آج بھی جاری ہے۔ علماء اور مفتیانِ کرام اپنی گہری علمی بصیرت کے ذریعے امت کی انفرادی اور اجتماعی رہنمائی کر رہے ہیں۔ ان کی یہ کوششیں امت کو شریعت کے دائرے میں عبادات

ومعاملات انجام دینے میں مدد فراہم کرتی ہیں اور مسلمانوں کے ایمان کو محفوظ رکھتی ہیں۔

فقہ وفتاویٰ کی اہمیت آج بھی باقی ہے

آج کے پیچیدہ دور میں، جب ہر طرف فکری اور عملی چیلنجز کا سامنا ہے، فقہ وفتاویٰ کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ امت مسلمہ کو ایسے علماء اور مفتیانِ کرام کی ضرورت ہے جو کتاب وسنت کے گہرے علم کے ساتھ عصری تقاضوں کو سمجھتے ہوں اور ان کا حل پیش کر سکیں۔

خادم کا علمی سفر

یہ خادم پچاس سال سے اس عظیم خدمت سے وابستہ ہے۔ الحمدللہ، اس عرصے میں جو علمی گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی، وہ اللہ کی خاص نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خادم کو فتاویٰ نویسی کے ذریعے امت کی خدمت کا موقع عطا فرمایا، اور اس کا ثمرہ ''حبیب الفتاوی'' کی شکل میں سامنے آیا۔ الحمدللہ، اس وقت یہ مجموعہ آٹھ جلدوں میں امت کے ہاتھوں میں پہنچ چکا ہے، اور نویں جلد آپ حضرات کی خدمت میں پیش ہے۔

علمی خدمات کی دعا

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس خادم کو صحت وعافیت کے ساتھ لمبی زندگی عطا فرمائے، ہر قسم کے شرور وآفات سے محفوظ رکھے، اور بقیہ علمی کاموں کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس فقیر کو دینِ اسلام کی خدمت کے لیے تا حیات

قبول فرمائے۔

چند اشعار برائے ترغیب:

خدمتِ دین ہو عبادت کی طرح
ہر قدم ہو شوقِ طاعت کی طرح

علم کی روشنی ہر دل میں جلے
دل ہو آئینہ شریعت کی طرح

فتاویٰ کی خوشبو سے معطر ہو جہاں
ہر عالم ہو ہدایت کی طرح

فقط والسلام

آپ کا خادم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

شیخ الحدیث وصدر مفتی

بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ دار العلوم مہذب پور

سنجر پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا

۲/۶/۱۴۴۶ھ

﴿کتاب الطھارت﴾

جس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوں وہ پاکی کس طرح حاصل کرے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ ایک شخص کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے اپنے ہاتھ سے استنجاء پاک کرنے سے وہ معذور ہے تو کیا ایسا شخص اپنی بیوی یا کسی دوسرے سے استنجاء پاک کرواسکتا ہے؟ جواب سے سرفراز فرمائیں، عنایت ہوگی۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

اگر اس معذور شخص کی بیوی موجود ہو تو دوسرے کسی بھی فرد سے استنجاء پاک کروانا جائز نہیں بلکہ اس کی یہ ضرورت بیوی بحسن وخوبی انجام دے سکتی ہے۔ ہاں اگر اس کی بیوی نہ ہو یا انتقال کرگئی ہو یا یہ شخص غیر شادی شدہ ہو تو اپنے محارم میں سے کسی محرم کے ذریعہ بدرجۂ مجبوری استنجاء پاک کرواسکتا ہے، بشرطیکہ ستر اور شرمگاہ سے نظر ہٹا کر یہ عمل کیا جائے بلکہ بعض فقہاء نے ایسے معذور شخص سے جبکہ اس کی بیوی نہ ہو استنجاء پاک کرنے کو معاف کردیا ہے۔

فمن ذلک عدم تکلیف الصبی والمجنون ففوض امر

امـوالهـمـا إلـى الـولـي و تربيته وحضانته إلى النساء رحمةعليه (الاشباہ والنظائر، ص:۱۳۵)۔

الـمـرأة المريضة إذا لم يكن لها زوج و عجزت عن الوضوء ولهـا ابـنة او اخـت توضئها و يسقط عنها الاستنجاء، (ہندیہ الباب السابع فی احکام النجاسات الفصل الثالث فی الاستنجاء، زکریا، قدیم، ج:۱، ص:۵۰)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿کتاب الصلاۃ﴾

سجدہ سہو صرف ایک سجدہ کرنے کا حکم

سوال: ایک صاحب نے عصر کی نماز پڑھائی اور نماز میں کوئی ایسی غلطی ہوگئی جو موجب سجدہ سہو ہے، چنانچہ امام صاحب نے سجدہ سہو بھی کیا لیکن سجدہ سہو کرتے ہوئے صرف ایک ہی سجدہ کیا دوسرا سجدہ بھول گئے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ سجدہ سہو کی ادائیگی ہوگی یا نہیں؟ اور نماز درست ہوئی یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

سجدۂ سہو میں دونوں سجدوں کی حیثیت واجب کی ہے، لہٰذا دونوں سجدے ضروری ہیں، ایک سجدہ کرنے سے سجدہ سہو کی ادائیگی نہیں ہوگی، لہٰذا نماز کا اعادہ اور دوبارہ پڑھنا ضروری ہے۔

یجب سجدتان. باب سجود السہو (نورالایضاح، ص:۱۱۵)، **(سجدتان) لانہ صلی اللہ علیہ وسلم سجد سجدتین بسہو وھو جالس بعد التسلیم و عمل بہ الاکابر من الصحابۃ و التابعین** (مراقی الفلاح، ص:۹۳ ایضاً)، **یسجد للسہو فی الزیادۃ و النقصان سجدتین**

بعد السلام (إلی قوله) و لنا قوله علیه السلام لکل سهو سجدتان بعد السلام (ہدایہ،ص:۱۳۶،ج:۱،ایضاً)، وہکذا فی الفتاوی رحیمیہ، ج پنجم وششم،ص:۱۸۶)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

وتر کی نماز میں تکبیر کہنا اور ہاتھوں کو کانوں تک اٹھانے کا حکم

سوال: وتر کی نماز کی تیسری رکعت میں دعاءقنوت سے پہلے تکبیر کہنا اور دونوں ہاتھوں کو کانوں تک اٹھانا حدیث پاک سے ثابت ہے یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

وتر کی تیسری رکعت میں دعاءقنوت پڑھنے سے پہلے تکبیر کہنا اور دونوں ہاتھوں کو کانوں تک اٹھانا حدیث پاک اور آثار سے ثابت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ثم إذا اراد القنوت کبر و رفع یدیه عندنا الخ (کبیری،ص:۳۹۷)

قال احمد إذا قنت قبل الرکوع کبر قال ابن قدامه فی المغنی وقدر روی عن ابن عمر انه کان إذا فرغ من القراء ة کبر، و فی الذخیرة، رفع یدیه حذاء اذنیه وهو یروی عن ابن مسعود و ابن عمر و ابن عباس و ابی عبیدة (غنیۃ المستملی،ص:۳۹۷)، (وہکذا فی فتاوی دارالعلوم، ج:۴،ص:۱۶۵)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

قعدہ اخیرہ میں شریک ہوتے ہی امام نے سلام پھیر دیا اب مقتدی کیا کرے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ ایک شخص نماز میں امام کے ساتھ اس وقت شریک ہوا جب امام قعدہ اخیرہ میں تھا، اس شخص کے شریک ہوتے ہی امام نے سلام پھیر دیا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ شخص فوراً اپنی نماز پوری کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے یا التحیات پڑھ کر تب کھڑا ہو؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

صورت مسئولہ میں حکم یہ ہے کہ وہ شخص التحیات پڑھ کر تب اپنی نماز پوری کرنے کے لئے کھڑا ہو، لیکن اگر التحیات پڑھے بغیر کھڑا ہو گیا تو بھی اس کی نماز ہو جائے گی، لیکن ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

قال فی الدر بخلاف سلامه أو قيامه لثالثة قبل اتمام الموتم التشهد فإنه لايتابعه بل يتمه لوجوبه ولو لم يتم جاز وفی الشامية (قوله فانه لا يتابعه الخ) ولو خاف ان تفوته الركعة الثالثة مع الامام كما صرح به فی الظهيرية ويشمل باطلا قه ما لو اقدی به فی اثناء التشهد الاول او الاخير فحصل قعدة قام امامه او سلم انه يتم التشهد ثم يقوم ولم اره صريحاً ثم رأيته فی الذخيرة ناقلاً عن ابی الليث المختار عندی انه يتم التشهد وان

لم یفعل اجزاه و له الحمد (قوله ولو لم یتم جاز) ای صح مع کرهة التحریم کما افاده (ردالمحتار، ج۱،ص:۴۶۳، وہکذا فی احسن الفتاوی، ج:۳،ص:۳۷۶)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

امام کا آنے والے نمازی کی وجہ سے رکوع لمبی کر دینا؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ زید مغرب کی نماز پڑھا رہا تھا، رکوع کی حالت میں اس کو محسوس ہوا کہ اس کا دوست خالد تیزی کے ساتھ جماعت میں شریک ہونے کے لئے آرہا ہے، اس کی وجہ سے اس نے رکوع کی تسبیح لمبی کر دی تاکہ وہ مسبوق نہ ہو۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کا ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً ومصلیاً

زید کا ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے، لیکن اگر زید یہی کام ایسے شخص کے لئے کرے جس سے وہ واقف نہ ہو تب مکروہ نہیں ہے، اور اگر زید کی نیت اس سے تقرب الی اللہ کی ہو تب بالاتفاق مکروہ نہیں ہے، لیکن اس سے احتراز بہتر ہے۔

قال شارح التنویر رحمة اللّٰه تعالیٰ و کره تحریماً اطالة رکوع أو قراءة لادراک الجائی ای ان عرفه و إلا فلا بأس به ولو اراد التقرب إلی اللّٰه تعالیٰ لم یکره اتفاقاً لکنه نادر و تسمی مسألة الریا،

فینبغی التحرز عنہا (ردالمحتار، ج ا،ص:۴۶۲)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

قرأت سے فارغ ہونے کے بعد جماعت میں شریک ہونے والا مقتدی ثناء پڑھے یانہیں؟

سوال: کیافرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ زید ظہر کی نماز میں اس وقت شریک جماعت ہوا جب امام قراءۃ سے فارغ ہو چکا تھا، تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کے لئے اس حال میں ثناء پڑھنے کی اجازت ہے یانہیں؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

صورت مسئولہ میں زید کو چاہئے کہ ثناء پڑھے چونکہ امام کی ثنا مقتدی کی ثناء نہیں ہے۔

و أما الثناء فهو سنة مقصودة لذاتها وليس ثناء الامام ثناء للموتم فاذا تركه يلزم ترك سنة مقصودة لذاتها للانصات الذى هو سنته تبعا بخلاف ترك حالة الجهر (ردالمحتار، ج ا،ص:۴۵۶)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

ٹائی لگا کر نماز کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں ٹائی جو یہود و نصاری کا مخصوص شعار ہے اس کو پہن کر نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

ٹائی پہن کر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، اور ایسی نماز واجب الاعادہ ہے۔ **من تشبه بقوم فهو منهم هكذا في احسن الفتاوی، جلد ۳، ص: ۴۳۹** کے تحت اس کی قباحت میں مزید شدت پیدا ہو جاتی ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

تکبیر تحریمہ اور تکبیرات انتقالیہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ امام کے لئے تکبیر تحریمہ اور تکبیرات انتقالیہ کیا زور سے کہنا ضروری ہے یا آہستہ بھی وہ کہہ سکتا ہے، اگر زور سے کہنا ضروری ہے تو اس کی حد کیا ہے؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

امام کے لئے تکبیر تحریمہ اور تکبیرات انتقالیہ کا زور سے کہنا سنت ہے، اس کے

چھوڑنے پر ترک سنت کا گناہ ہوگا، اور جہر کی حد یہ ہے کہ صف اول تک امام کی آواز پہونچے، ساری صفوں تک یا سارے نمازیوں تک آواز کا پہونچانا ضروری نہیں ہے۔

قال فی شرح التنویر فی سنن الصلوة و جهر الامام بالتكبير بقدر حاجته للاعلام بالدخول والانتقال و كذا بالتسميع والسلام و فی الشامية و اشار لقوله والانتقال إلى ان المراد بالتكبير هنا ما يشمل تكبيرة الاحرام وغيره (ردالمحتار، ج۱، ص:۴۴۳)۔ و ايضا فی فصل القراءة من الشامية قال فی الخلاصة والخانية عن الجامع الصغير ان الامام إذا قرء فی صلوة المخافة بحيث سمع رجل او رجلان لايكون جهراً و الجهر ان يسمع الكل. اى كل الصف الاول لا كل المصلين بدليل ما فی القهستانی عن المسعوديه ان جهر الامام اسماع الصف الاول اه (إلى قوله).

فقد ظهر بهذا ان ادنى المخافة اسماع نفسه اومن يقربه من رجل او رجلين مثلاً و اعلاها مجرد تصحيح الحروف كما هو مذهب الكرخی ولا تعتبر هنا فی الاصح و ادنى الجهر اسماع غيره ممن ليس بقربه كاهل الصف الاول و اعلاه لاحد له، فافهم واغتنم هذا تحرير هذا المقام فقد اضطرب فيه كثير من الافهام (ردالمحتار، ج۱، ص:۴۹۹)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

تکبیر تحریمہ سے پہلے انی وجہت الآیۃ پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ مصلی یہ کھڑے ہوکر تکبیر تحریمہ سے پہلے یہ دعاء "إنی وجہت إلی وماأنامن المشرکین" پڑھنے میں کوئی قباحت ہے؟ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟ برائے مہربانی مدلل رہنمائی فرمائیں۔

جواب: الجواب و بالله التوفيق:

تکبیر تحریمہ سے قبل اس آیت کا پڑھنا قرآن وحدیث، صحابہ وتابعین سے ثابت نہیں، لہٰذا اس کا پڑھنا بے اصل اور قابل ترک ہے۔

عن عائشةؓ قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من احدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهورد (متفق علیہ، مشکوۃ شریف ج:۱،ص:۲۷)۔

باب الاعتصام بالكتاب والسنة، و في الحديث فعليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين المهديين تمسكوابها وعضوا عليها بالنواجذ و إياكم ومحدثات الامور فان كل محدثة بدعة و كل بدعة ضلالة (رواہ احمد وابوداؤد والترمذی وابن ماجہ، مشکوۃ، ج۱،ص:۳۰، وکذا یفہم من الفتاوی القاسمیۃ، ج:۵، ص:۶۱۰، ج:۵،ص:۶۱۳)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

طوال، اوساط، قصار مفصل کی تقسیم کس نے کی؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ فجر وظہر کی نماز میں طوال مفصل، اور عشاء کی نماز میں اوساط مفصل، اور مغرب کی نماز میں قصار مفصل کے پڑھنے کو جو سنت کہا جاتا ہے تو کیا یہ تقسیم اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یا کسی صحابیؓ نے یہ تقسیم کی ہے، امید کہ جواب سے نوازیں گے۔ فقط والسلام

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

یہ تقسیم کسی حدیث شریف سے ثابت نہیں، البتہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسی اشعریؓ کے پاس ایک مکتوب بھیجا جس میں یہ ہدایت تھی کہ فجر وظہر میں طوال مفصل، عصر وعشاء میں اوساط مفصل، مغرب میں قصار مفصل، کی قرأت کی جائے۔

والاصل فيه كتاب عمرؓ إلى أبي موسىٰ الاشعريؓ أن اقرأ في الفجر والظهر بطوال المفصل و في العصر والعشاء باوساط المفصل و في المغرب بقصار المفصل (ہدایہ، ج:۱، ص:۱۰، باب صفقۃ الصلوۃ)۔

تاہم بے شمار احادیث شریفہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے فجر میں سورہ طور، سورہ ق، سورہ تکویر، ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں ''الم سجدہ'' کی مقدار قیام، عصر میں سورہ بروج، سورہ طارق، عشاء میں سورہ شمس، مغرب میں سورہ کافرون، سورہ اخلاص کا پڑھنا ثابت ہے، اور کبھی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فجر میں معوذتین،

اور مغرب میں سورہ طور، سورہ نجم، سورہ والمرسلات پڑھنا بھی ثابت ہے (حاشیہ شرح وقایہ، ج:ا،ص:۱۵۰)

وقد وردت فی ھذہ الابواب اخبار کثیرۃ (مالابد منہ،ص:۴۷)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

عورتوں کا آخری صف میں کھڑے ہونے کی حکمت

سوال: اس حدیث کا آخری ٹکڑا یعنی **خیر صفوف النساء آخرھا وشرھا اولھا.**

شرھا الخ سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کا پہلی صف میں کھڑا ہونا برا ہے تو کیا مطلب برا ہونیکا؟ کہ پہلی صف میں انکا کھڑا ہونا ہی جائز نہیں ہے؟ یا کھڑی تو ہوسکتی ہیں لیکن اچھا نہیں ہے، اور کیا یہ برائی صرف پہلی ہی صف کیلئے ہے یا دوسری تیسری ساری ہی صفوں کیلئے، اور کیا کبھی بھی عورتیں دور نبوی وغیرہ میں پہلی صف میں کھڑی نہیں ہوئی ہیں؟ واضح فرمائیں، کرم ہوگا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

حدیث میں مذکور الفاظ ”**خیر صفوف النساء آخرھنا وشرھا أولھا**“ سے یہ مراد ہے کہ عورتوں کے لیے آخری صف بہتر ہے اور پہلی صف میں کھڑا ہونا بہتر نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلی صف میں کھڑا ہونا ناجائز ہے، بلکہ یہ ایک تقاضا ہے کہ عورتیں زیادہ سے زیادہ پردہ اور احتیاط کی رعایت کریں۔ لہٰذا پہلی

صف میں کھڑی ہوسکتی ہیں، لیکن آخری صف میں کھڑا ہونا زیادہ بہتر اور مناسب ہے۔

یہ برائی صرف پہلی صف کے لیے ہے، یعنی عورتوں کے لیے جو پہلی صف میں کھڑی ہوں وہ آخری صف کے مقابلے میں کم بہتر ہیں۔ دیگر صفوں میں کھڑی ہونے میں اتنی برائی نہیں ہے جتنی پہلی صف میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی صف عام طور پر مردوں کے زیادہ قریب ہوتی ہے، اس لیے اس میں کھڑا ہونا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

عہد نبوی میں بھی عورتیں نماز میں شریک ہوتی تھیں، اور اس وقت ان کے لیے مردوں کے پیچھے صفیں ہوتی تھیں۔ اگرچہ پہلی صف میں کھڑا ہونا ممنوع نہیں تھا، لیکن افضل یہی تھا کہ وہ پیچھے کی صفوں میں کھڑی ہوں تاکہ پردہ اور احتیاط کی رعایت رہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

ما کنا نکذب بیوم الدین پڑھنے سے نماز کا حکم

سوال: حضرت مسئلہ یہ تھا کہ سورۃ مدثر کے اندر وکُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّين کی جگہ اگر وَمَا كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدين پڑھ دیا تو نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟ فقہ حنفی کی معتبر و مستند کتابوں کے حوالہ سے جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً ومصلیاً

سورہ مدثر کی آیت "وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّين" کی جگہ اگر "وَمَا كُنَّا

نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ'' پڑھا جائے تو نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ اس سے آیت کا مفہوم تبدیل ہو جاتا ہے۔ اصل آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اور ہم روز جزا کو جھٹلاتے تھے، جبکہ ''وَمَا كُنَّا نُكَذِّبُ'' کا مطلب ہو جائے گا کہ اور ہم روز جزا کو جھٹلاتے نہیں تھے۔ اس طرح معنوی تبدیلی کی وجہ سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں سے حوالے

۱- درمختار:

من قرأ في صلاته بغير الترتيب الذي في المصحف وغير معنى القرآن فسدت صلاته (درمختار، جلد 1، صفحہ 616)۔

۲- ردالمحتار:

إذا وقع التغيير في المعنى فإن الصلاة تفسد، لأن المقصود من قراءة القرآن المعنى، فإذا تغير المعنى كان ذلك مفسداً (ردالمحتار، جلد 1، صفحہ 617)۔

۳- فتاویٰ ہندیہ:

وإن غير المعنى باللحن فسدت صلاته (فتاویٰ ہندیہ، جلد 1، صفحہ 90)۔

لہٰذا، اس طرح کی غلطی نماز کو فاسد کر دیتی ہے، اور اس صورت میں نماز کا اعادہ کرنا ضروری ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

مفتی اسد اللہ آسامی کے مغالطہ کی تصحیح

سوال: نماز ہوگئی، تاویل ممکن ہے ما مصدر یہ ہوکر تکذیب کے معنی میں ہوگا۔ یعنی سلقنا فی سقر تکذیبنا بیوم مفتی اسد اللہ صاحب آسامی کا جواب ہے۔

نماز میں امام نے **کنا نکذب بیوم الدین** کی جگہ **وما کنا نکذب بیوم الدین** پڑھ دیا تو اس کا جواب دے دیا گیا تھا کہ نماز نہیں ہوگی نماز فاسد ہو جائے گی، لیکن انہوں نے کوئی مفتی اسد اللہ صاحب اسامی ہیں ان کے حوالے سے یہ بتلایا ہے کہ اس میں تاویل ممکن ہے کہ ماں کو نافیہ کے بجائے ما کو مصدریا مان لیا جائے تو مفتی اسد اللہ کا یہ جواب صحیح ہے یا غلط فقہ حنفی کی معتبر اور مستند کتابوں کے حوالے سے اس کا جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً ومصلیاً

نماز میں قرآن کی تلاوت میں تحریف یا غلطی اگر معنی کو بگاڑ دے تو اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ آپ کے سوال کے مطابق امام نے "**کنا نکذب بیوم الدین**" کی جگہ "**ما کنا نکذب بیوم الدی**" پڑھا، تو اس میں "ما" کا استعمال ہے جس کے دو معنی ممکن ہیں: (۱) ما نافیہ، یعنی "ہم جھٹلایا نہیں کرتے تھے"، اور (۲) ما مصدریہ، یعنی ہم جھٹلانے کی حالت میں تھے"۔

فقہ حنفی کی رو سے نماز میں قرآن کی تلاوت میں ایسی غلطی جس سے معنی میں بگاڑ آ جائے اور کفریہ یا ناپسندیدہ معنی پیدا ہوں، نماز کو فاسد کر دیتی ہے۔ اس مسئلے میں

''ما'' کو مصدر مان کر تاویل کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ عمومی فہم اور قرآنی سیاق میں ''ما'' کا یہاں استعمال نفی کے لیے ہوتا ہے، جس سے معنی میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور مفہوم کے بگڑنے کا امکان ہوتا ہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب ''درمختار'' میں ہے۔

إذا أخطأ القارى فی قرائة الفاتحة أو غيرها بحيث تبدلت المعانی فالصلاۃ تفسد (درمختار مع ردالمحتار، ج1، ص498)۔

اسی طرح ''فتاویٰ ہندیہ'' میں ہے:

إذا غير حرفًا من القرآن أو كلمة أو حركة بحيث اختلف المعنى فسدت الصلاۃ (فتاویٰ ہندیہ، ج1، ص:77)۔

ان عبارات سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر تلاوت میں ایسی غلطی ہو جس سے معنی میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ لہٰذا مفتی اسداللہ صاحب کی رائے کہ اس میں تاویل ممکن ہے، درست نہیں ہے، کیونکہ اس غلطی سے معنی میں واضح بگاڑ آرہا ہے، اور اس وجہ سے نماز فاسد ہو جائے گی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

سر اور جہر کی مقدار

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیان کرام اس مسئلے میں ایک آدمی نماز میں

صرف زبان سے آیات کی تلاوت کررہاہےاورآوازاتنی ہلکی ہے کہ وہ خودبھی نہیں سن پارہاہے،بس زبان سےکلمات کواداکررہاہے،تو معلوم یہ کرنا ہے کہ اس پر سر کا اطلاق ہوگا یانہیں؟ مفتی بہ قول کے مطابق مستند و معتبر فقہ حنفی کی کتابوں کے حوالے سے اس کو بتائیں کیا اس طرح قرات کرنا ضروری ہے کہ خودکوسنائی دے یاخالی زبان سے اداکرناالفاظ کوپڑھنا کافی ہے۔

جواب: الجواب حامداً ومصلیاً

نماز میں قرات کے درست ہونے کے لیےضروری ہے کہ تلاوت اس طرح کی جائے کہ کم ازکم خود پڑھنے والے کوآواز سنائی دے۔اگرکوئی شخص اس طرح تلاوت کرے کہ زبان سے الفاظ توادا ہورہے ہوں،لیکن آوازاتنی ہلکی ہوکہ خودبھی نہ سن سکے،توایسی قراءت کوشرعی اعتبار سے''سری''(آہستہ قرات)نہیں کہاجائے گا اوراس سےنماز درست نہ ہوگی۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں اس مسئلے کی وضاحت موجودہے۔بدائع الصنائع میں ہے:

وهو أن يحرك لسانه بحيث يسمع نفسه إن لم يكن بها مانع؛ لأنهم قالوا: لايجوز بغير تحريک اللسان ''و لو كان العاجز عن السمع أو النطق'' (بدائع الصنائع،جلد1،صفحہ 199)۔

اسی طرح فتح القدیر میں ہے:

القراءة في السر هو أن يسمع نفسه إذا لم يمنع مانع من صمم

ونحوہ (فتح القدیر، جلد1، صفحہ 235)۔

لہذا، نماز میں قراءت کے لیے ضروری ہے کہ کم از کم خود کو سنائی دے، صرف زبان سے الفاظ ادا کرنا کافی نہیں ہے۔ لیکن بعض معاصر علماء نے اس صورت میں بھی نماز کو درست قرار دیا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

پیشاب کی تھیلی کے ساتھ نماز وتلاوت کا حکم

سوال: ایک خاتون ہے ان کی پیشاب کی تھیلی لگی ہے تو وہ نماز کیسے پڑھے گی؟ اور قرآن کیسے پڑھے گی؟ کپڑے تو پاک ہوتے ہے لیکن پیشاب کی تھیلی لگی ہے باہر سے، فقہ حنفی کی معتبر ومستند کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

برائے کرم جواب عنایت فرمایئے۔

جواب الجواب حامداً ومصلیا

ایسی خاتون جن کی پیشاب کی تھیلی لگی ہو، ان کا حکم فقہ حنفی کے مطابق ''معذور'' کا ہے۔ معذور کے احکام یہ ہیں کہ جب کسی شخص کو اس طرح کی بیماری ہو کہ اس سے وضو کی حالت میں پیشاب، خون یا کوئی اور ناقص چیز مسلسل جاری رہتی ہو اور ایک نماز کا مکمل وقت اس حالت میں گزر جائے کہ وہ کسی طرح مکمل طور پر پاک نہ

رہ سکے، تو وہ معذور شمار کیا جائے گا۔

ایسی صورت میں معذور خاتون کے لیے نماز پڑھنے کا طریقہ یہ ہوگا:

۱- ہر نماز کے وقت کے آغاز میں وضو کریں، چاہے وضو کے فوراً بعد ہی پیشاب کی تھیلی سے کچھ نکل آئے، اس کے باوجود وہ اس وضو کے ساتھ پورا وقت نماز، قرآن کی تلاوت اور دیگر عبادات کر سکتی ہے۔

۲- وضو ہر نماز کے وقت میں دوبارہ کرنا ہوگا۔

۳- کپڑوں کا پاک ہونا ضروری ہے، لیکن اگر پیشاب کی تھیلی کے وجہ سے کپڑوں میں ناپاکی لگنے کا اندیشہ ہو تو ہر نماز سے پہلے اسے صاف کر لے اور پاک کپڑے پہن لے، اگر ناپاکی نہ لگے تو جو کپڑے پہنے ہوئے ہیں وہی کافی ہیں۔

قرآن کی تلاوت کا بھی یہی حکم ہے، وہ قرآن کی تلاوت کر سکتی ہیں، بشرطیکہ وضو ہو، اور وضو کرنے کے بعد وہ حالت برقرار رہے، چاہے پیشاب کی تھیلی سے کچھ نکل آئے، اس سے معذور کا وضو نہیں ٹوٹتا۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں اس کے متعلق ہے:

''الدر المختار'' میں ہے:

المعذور من لا یجد فی جمیع وقت الصلاۃ زمانا یسع الوضو والصلاۃ (الدر المختار، جلد 1، صفحہ 303)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

المبتلی بہ کثرۃ الخارج حکمہ حکم المعذور (فتاوی ہندیہ، جلد 1، صفحہ 38)۔

لہٰذا، ایسی خاتون کا نماز پڑھنا اور قرآن کی تلاوت کرنا اسی طریقے پر ہوگا جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

نوافل وسنن کی ہر رکعت میں ایک ہی سورت پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک آدمی حافظ قرآن ہے لیکن وہ چار رکعت والی نماز میں ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد جان بوجھ کر ایک ھی سورت پڑھتا ہے، یعنی ایک ہی سورت چاروں رکعت میں پڑھتا ہے تو فقہ حنفی کی معتبر اور مستند کتابوں کے حوالے سے بتلائیں کہ یہ کیسا ہے؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں اس مسئلے کی وضاحت ان عبارات میں ملتی ہے۔

۱-فتاوی عالمگیری (ہدایہ):

"ولو قرأ فی کل رکعة سورة واحدة یکررها، یکره تنزیها"

(فتاوی عالمگیری جلد 1، صفحہ 70)۔

۲-الدر المختار مع رد المحتار (شامی):

"یکرہ تکرار سورۃ واحدۃ فی کل رکعۃ من فرض أو غیرہ" (ردالمحتار، جلد1، صفحہ 513)۔

۳-البحرالرائق:

"ویکرہ تکرار سورۃ فی رکعات الفرض" (البحرالرائق، جلد1، صفحہ 356)۔

ان کتابوں کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض نماز میں ایک ہی سورت کو بار بار دہرانا مکروہ تنزیہی ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم
مفتی حبیب اللہ قاسمی

رکعات کی تعداد میں شک کی صورت میں کیا کرے؟

سوال: مسلم شریف کی حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا تم میں سے کوئی جب نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو شیطان اگر اسے شبہ میں ڈال دیتا ہے حتیٰ کہ وہ نہیں جانتا کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں۔ تم میں سے کوئی جب یہ کیفیت پائے تو آخری تشہد میں بیٹھنے کے بعد دو سجدے کر لیں۔ اس حدیث کی فقہ حنفی کی معتبر و مستند کتابوں کے حوالے سے جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

الدرالمختار اور الفتاوی الہندیہ میں اس مسئلے کی وضاحت موجود ہے۔

۱-الدرالمختار مع ردالمحتار:

عبارت:

”وَإِذَا شَکَّ فِی الرَّکَعَاتِ یَبْنِی عَلَی الْیَقِینِ وَهُوَ الْأَقَلُّ، وَیَسْجُدُ لِلسَّهْو“ (الدر المختار مع رد المحتار، جلد2، صفحہ 93)۔

ترجمہ: جب کوئی شخص رکعتوں میں شک کرے تو یقین پر عمل کرے یعنی کم تعداد پر، اور سجدہ سہو کرے۔

۲-الفتاوی الہندیہ:

عبارت:

”إِذَا شَکَّ فِی الرَّکَعَاتِ بَنَی عَلَی الْیَقِینِ وَهُوَ الْأَقَلُّ، وَیَسْجُدُ لِلسَّهْوَ فِی آخِرِ صَلَاتِهِ“ (الفتاوی الہندیہ، جلد1، صفحہ 134)۔

ترجمہ: جب کوئی رکعتوں میں شک کرے تو یقین پر عمل کرے یعنی کم تعداد پر، اور اپنی نماز کے آخر میں سجدہ سہو کرے۔

یہ دونوں عبارتیں واضح کرتی ہیں کہ فقہ حنفی میں بھی حدیث کے مطابق شک کی صورت میں کم تعداد کو اختیار کرتے ہوئے سجدہ سہو کا حکم دیا گیا ہے۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

نماز میں اٹھنے اور بیٹھنے کا طریقہ

سوال: نماز میں سجدہ میں جانے اور اٹھنے کا مسنون طریقہ فقہ حنفی کی معتبر و مستند

کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی کی معتبر و مستند کتابوں کے مطابق سجدہ میں جانے اور سجدہ سے اٹھنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ:

۱-سجدہ میں جانے کا طریقہ:

سجدہ میں جاتے وقت سب سے پہلے گھٹنے زمین پر رکھے جائیں، پھر ہاتھ، پھر ناک اور آخر میں پیشانی رکھی جائے۔ اس طریقے کو فقہ حنفی کی معتبر کتب میں مسنون قرار دیا گیا ہے، کیونکہ یہ طریقہ نبی کریم ﷺ کی سنت کے موافق ہے۔

۲-سجدہ سے اٹھنے کا طریقہ:

سجدہ سے اٹھتے وقت سب سے پہلے پیشانی، پھر ناک، پھر ہاتھ اور آخر میں گھٹنے اٹھائے جائیں۔ اس ترتیب کو اپنانا مستحب ہے کیونکہ یہ وقار اور سنت کے موافق ہے۔

مراجع:

-علامہ حصکفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "**وَيَضَعُ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ فِي النُّزُولِ وَيَرْفَعُهُمَا آخِرًا فِي الْقِيَامِ**" (الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب صفۃ الصلاۃ)۔

-امام ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے بھی اس ترتیب کی توثیق کی ہے۔ (رد المحتار علی الدر المختار)۔

یہ ترتیب سجدہ میں وقار اور خشوع پیدا کرتی ہے، اسی لیے اسے اختیار کرنا افضل ہے۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

الجواب حامداً و مصلیاً

نماز میں سجدہ میں جانے اور اٹھنے کا مسنون طریقہ فقہ حنفی کے مطابق یہ ہے کہ سجدہ میں جاتے وقت پہلے گھٹنے زمین پر رکھے جائیں، پھر دونوں ہاتھ، پھر ناک، اور آخر میں پیشانی رکھی جائے۔ اسی طرح سجدے سے اٹھتے وقت پہلے پیشانی، پھر ناک، پھر دونوں ہاتھ، اور آخر میں گھٹنے اٹھائے جائیں۔ اس ترتیب کی بنیاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر ہے۔

اعضا کا رکھنے کا طریقہ:

۱- ہاتھ:

سجدے میں دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر رکھے جائیں، انگلیاں ملی ہوئی ہوں اور قبلہ رخ ہوں۔

۲- پیشانی اور ناک:

پیشانی اور ناک دونوں زمین پر رکھے جائیں تا کہ سجدہ مکمل ہو۔

۳- کہنیاں:

کہنیاں زمین سے بلند اور پہلو سے جدا رکھی جائیں۔

۴- پیٹ اور رانیں:

پیٹ کو رانوں سے جدا رکھا جائے تاکہ سجدہ کا طریقہ صحیح رہے۔

۵- پاؤں کی انگلیاں:

پاؤں کی انگلیاں قبلہ رخ زمین پر رکھی جائیں اور پاؤں کھڑے رکھے جائیں۔
یہ طریقہ فقہ حنفی کی مستند کتابوں جیسے ''الدر المختار''، ''رد المحتار''، اور ''فتح القدیر'' میں مذکور ہے۔ ان کتب میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ سجدہ میں اعضا کو اس ترتیب سے رکھنے سے سنت کی پیروی ہوتی ہے اور نماز مکمل ہوتی ہے۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

الجواب حامداً و مصلیاً

نماز میں سجدہ کے مسنون طریقے کے حوالے سے فقہ حنفی کی معتبر کتابوں سے حوالہ جات درج ذیل ہیں:

۱- الدر المختار مع رد المحتار:

علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وَيَضَعُ رُكْبَتَيْهِ، ثُمَّ يَدَيْهِ، ثُمَّ وَجْهَهُ فِي السُّجُودِ، وَيَرْفَعُ وَجْهَهُ،

ثُمَّ يَدَيْهِ، ثُمَّ رُكْبَتَيْهِ فِي الِاعْتِدَالِ" (ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب صفۃ الصلاۃ)۔

۲-فتح القدیر:

امام ابن ہمام رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فَيَضَعُ رُكْبَتَيْهِ أَوَّلًا، ثُمَّ يَدَيْهِ، ثُمَّ وَجْهَهُ، وَإِذَا نَهَضَ رَفَعَ وَجْهَهُ أَوَّلًا، ثُمَّ يَدَيْهِ، ثُمَّ رُكْبَتَيْهِ" (فتح القدیر، کتاب الصلاۃ، باب صفۃ الصلاۃ)۔

یہ عبارات واضح طور پر بتلاتی ہیں کہ سجدہ میں جانے اور اٹھنے کا مسنون طریقہ یہی ہے کہ پہلے گھٹنے، پھر ہاتھ، اور آخر میں پیشانی رکھی جائے اور اسی ترتیب سے اٹھا جائے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

وضو کا صرف گمان ہو تو نماز کا حکم

سوال: ایک سوال یہ ہے کہ میرے پاس وضو نہیں ہے اور میرا صرف اندازہ ہے کہ میرے پاس وضو ہے تو میں اس حالت سے میں نماز پڑھ لوں تو وہ نماز قبول ہے کہ نہیں؟ اگر قبول نہیں ہے تو دوبارہ پڑھنا پڑے گا؟ یہ مسئلہ نماز میں بھی ہے اور زکوۃ میں بھی ہے اور سب چیز میں آپ کو جس جگہ ڈاؤٹ ہو تو کیا کرنا چاہئے، بتا دیجیے جزاک اللہ۔

جواب: الحواب حامداً و مصلیاً

آپ کا سوال یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو وضو کے بارے میں شک ہو اور وہ صرف گمان کی بنیاد پر نماز پڑھ لے، تو کیا وہ نماز قبول ہوگی یا نہیں؟ اور کیا ایسی حالت میں عبادت کا اعادہ کرنا ضروری ہوگا؟

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں کے مطابق، عبادت کی صحت کے لیے طہارت (وضو) شرط ہے، اور طہارت کے بارے میں یقین ہونا ضروری ہے۔ اگر وضو کے بارے میں شک ہو، اور غالب گمان یہ ہو کہ وضو نہیں ہے، تو وضو کرنا واجب ہے۔ شک کی حالت میں بغیر وضو کے نماز پڑھنے سے نماز صحیح نہیں ہوگی اور اس کا اعادہ ضروری ہوگا۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں کے حوالے:

۱- الدر المختار مع رد المحتار (فتاویٰ شامی) میں ہے:

"فلو شک فی الحدث وهو متیقن للطهارة أو بالعكس بنی علی الیقین ولا عبرة بالشک" (الدر المختار، کتاب الطہارۃ، باب الحیض)۔

ترجمہ: اگر کسی شخص کو حدث (ناپاکی) کے بارے میں شک ہو جبکہ وہ طہارت (وضو) کے بارے میں یقین رکھتا ہو، یا بالعکس، تو وہ یقین پر عمل کرے گا اور شک کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔

۲- فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"إذا شک فی الطهارة، فإن كان غالب ظنه أنه غیر متوضء، توضأ، وإلا فلا" (الفتاوی الہندیۃ، کتاب الطہارۃ)۔

ترجمہ: اگر کسی کو طہارت (وضو) کے بارے میں شک ہو اور غالب گمان یہ ہو کہ وہ غیر متوضی ہے، تو اسے وضو کرنا چاہئے، ورنہ نہیں۔

مذکورہ حوالہ جات سے واضح ہوتا ہے کہ عبادت کی صحت کے لیے طہارت یقینی ہونی چاہیے، اور شک کی بنیاد پر عبادت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اگر وضو کے بغیر نماز ادا کی گئی اور بعد میں وضو نہ ہونے کا علم ہوا، تو اس نماز کو دوبارہ پڑھنا ضروری ہوگا۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

عشاء پڑھنے کے گمان پر وتر ادا کرنے کے بعد یاد آیا کہ عشاء باقی ہے تو وتر دوبارہ پڑھنی ہوگی؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے یہ سمجھ کر کہ وہ عشاء کی نماز پڑھ چکا ہے وتر کی نماز پڑھ لی بعد میں یاد آیا کہ اس کی عشاء کی نماز باقی ہے تو کیا عشاء پڑھنے کے بعد وتر دوبارہ پڑھنی ہوگی؟ یا پہلی والی وتر کافی ہوگی؟ فقہ حنفی کی مستند و معتبر کتابوں کے حوالے سے اس کا جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

صورت مسئولہ میں اگر کسی شخص نے عشاء کی فرض نماز پڑھے بغیر یہ گمان کر کے

کہ اس نے عشاء کی نماز پڑھ لی ہے، وتر کی نماز ادا کرلی، پھر بعد میں اسے یاد آیا کہ عشاء کی فرض نماز باقی ہے، تو ایسی صورت میں وتر کی نماز دوبارہ پڑھنی ضروری ہوگی۔

فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں یہ اصول موجود ہے کہ وتر کی نماز عشاء کے فرض کے بعد ادا کی جاتی ہے، لہٰذا اگر عشاء کے فرض باقی ہوں تو وتر ادا نہیں ہوسکتی۔ چونکہ اس شخص نے وتر کی نماز عشاء کے فرض کے بغیر ادا کی، اس لئے اس کی وتر نماز صحیح نہیں ہوئی اور عشاء کی فرض نماز ادا کرنے کے بعد وتر کی نماز کا دوبارہ ادا کرنا لازم ہوگا۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"إذا صلى الوتر قبل العشاء ظانًّا أنّه صلّى العشاء ثم تذكّر أنّه لم يصلّ العشاء يعيد الوتر" (الفتاویٰ الہندیہ، کتاب الصلاۃ، الباب الثانی فی الوتر والنفل، ج 1، ص 123، دار الفکر)۔

یعنی اگر کسی نے وتر کی نماز عشاء سے پہلے اس گمان میں پڑھ لی کہ اس نے عشاء کی نماز پڑھ لی ہے، پھر یاد آیا کہ عشاء کی نماز باقی ہے، تو اس پر لازم ہے کہ وتر کی نماز کو دوبارہ پڑھے۔

لہٰذا، مذکورہ شخص کو عشاء کی فرض نماز کے بعد دوبارہ وتر کی نماز پڑھنی ہوگی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

صرف دل سے نیت کرنے کا حکم

سوال: ایک شخص ظہر کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد گیا اس نے ظہر کی نیت زبان سے نہیں کی صرف دل میں نیت کر لی اس صورت میں اس کی ظہر کی نماز ہوگی یا نہیں؟ فقہ حنفی کی مستند و معتبر کتابوں کے حوالے سے اس کا جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

اگر کوئی شخص ظہر کی نماز کے لیے مسجد گیا اور اس نے ظہر کی نیت زبان سے نہیں کی بلکہ صرف دل میں نیت کی تو اس کی نماز صحیح ہوگی۔ فقہ حنفی کے مطابق نیت کا محل دل ہے اور نیت زبان سے ادا کرنا ضروری نہیں ہے۔ دل میں ارادہ کرنا کافی ہے، جیسا کہ معتبر کتب فقہ میں مذکور ہے۔

بدائع الصنائع میں ہے:

"وشرائط الصلاة من أربعة أشياء ... والرابع النية، وموضعها القلب؛ لأن النية من أعمال القلب، فلا يفتقر إلى النطق" (بدائع الصنائع، جلد 1، صفحہ 203، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔

ردالمحتار شامی میں بھی اسی بات کی وضاحت کی گئی ہے:

"فالنية شرط في كل عبادة، ومحلها القلب، فلو نوى بقلبه دون لسانه جاز" (ردالمحتار، جلد 1، صفحہ 375، دارالفکر)۔

ان عبارات سے واضح ہے کہ نیت دل کا عمل ہے اور زبان سے نیت کرنا شرط

نہیں ہے۔لہٰذا صرف دل میں نیت کرنے سے نماز درست ہو جاتی ہے۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

ظہر کی نیت سے گھر سے نکلا اور زبانی اسے عصر نکل گیا تو کیا حکم ہے؟

سوال: ایک شخص ظہر کی نماز پڑھنے کے لئے مسجد گیا لیکن زبان سے اس نے جو نیت کی ظہر کے بجائے عصر اس کی زبان سے نکلا حالانکہ گھر سے وہ ظہر کی نماز پڑھنے کی نیت سے نکلا تھا تو اس صورت میں اس کی ظہر کی نماز ہو گی یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

اگر کوئی شخص ظہر کی نماز پڑھنے کے لئے مسجد جائے اور دل میں ظہر کی نیت ہو، لیکن زبان سے غلطی سے عصر کی نیت کے الفاظ نکل جائیں تو اس کی نماز درست ہوگی اور ظہر ہی شمار ہوگی، کیونکہ نماز کی اصل نیت دل کے ارادے پر موقوف ہے، زبان سے الفاظ ادا کرنا شرط نہیں۔ فقہ حنفی میں نیت کی بنیاد دل کے ارادے پر ہوتی ہے، زبان سے نیت کرنا مستحب ہے، فرض نہیں۔

فقہ حنفی کی مستند کتاب ''فتاویٰ عالمگیری'' میں اس مسئلے کی وضاحت ان الفاظ میں موجود ہے:

''والـنِّيَّةُ مَحَلُّهَا القَلْبُ، لا الوُجُوبَ عَلَى اللِّسَانِ، فَلَوْ نَوَى فِي قَلْبِهِ

صَلَاةَ الظُّهْرِ وَذَكَرَ فِي لِسَانِهِ صَلَاةَ الْعَصْرِ تَكُونُ صَلَاتُهُ صَلَاةَ الظُّهْرِ"

(فتاویٰ عالمگیری، کتاب الصلاۃ، فصل فی النیۃ، جلد 1، صفحہ 94، مکتبہ طیبہ دیوبند انڈیا و دار الاشاعت کراچی)۔

یعنی نیت کا محل دل ہے، اور زبان سے نیت کے الفاظ کہنا ضروری نہیں، اس لیے اگر دل میں ظہر کی نیت کی اور زبان سے عصر کا لفظ نکل گیا تو نماز ظہر ہی شمار ہوگی۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

رکوع کی حالت میں تکبیر کہہ کر رکوع میں شامل ہونے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص عشاء کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد گیا امام رکوع میں جا چکا تھا اور چار صفیں نمازیوں کی مکمل ہو چکی تھیں، اس نے یہ سوچ کر کہ میرا رکوع نہ فوت ہو جائے ساتویں صف سے نیت باندھ کر جھکتے ہوئے پانچویں صف پہنچ گیا اور رکوع پا گیا اس نے تقریبا رکوع کی حالت میں تکبیر کہا اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس کی نماز ہوگی یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

سوال میں ذکر کردہ صورت میں جب کوئی شخص نماز میں شامل ہوتے وقت صفوں کے درمیان خالی جگہ پا کر صفوں کے اندر گھس کر یا جھک کر آگے بڑھتا ہے اور

رکوع میں شامل ہوتا ہے، تو اس کی نماز درست نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ صفوں کے درمیان اس طرح جھک کر یا دوڑ کر جانا مکروہ تحریمی ہے اور اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، بالخصوص جب تکبیر بھی اسی حالت میں کہی جائے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں اس طرح کی حرکت کے متعلق صراحت کے ساتھ حکم موجود ہے:

درمختار میں ہے:

"وَإِنْ زَحَفَ إِلَى الصَّفِّ فِي رُكُوعِهِ فَسَدَتْ صَلَاتُهُ" (ردالمحتار، کتاب الصلاۃ، باب الإمامۃ)۔

ترجمہ: اگر کوئی شخص صف کی طرف رکوع کی حالت میں جھک کر جائے، تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

اسی طرح البحر الرائق میں ہے:

"وَلَوْ مَشَى أَوْ زَحَفَ فِي حَالَتِهِ لِإِدْرَاكِ الرُّكُوعِ فَسَدَتْ صَلَاتُهُ" (البحر الرائق، کتاب الصلاۃ، باب صفۃ الصلاۃ)۔

ترجمہ: اگر کوئی شخص رکوع کو پانے کے لیے جھک کر یا چل کر صف کی طرف جائے تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

لہٰذا، اس شخص کی نماز درست نہیں ہوئی، اسے نماز دوبارہ ادا کرنی چاہیے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

عورت کا کلائی کھول کر نماز ادا کرنے کا حکم

سوال: ایک خاتون نے کلائی کھلی ہونے کی حالت میں نماز ادا کر لی تو کیا اسکی نماز ہو جائیگی؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

نماز کے دوران عورت کے لیے مکمل ستر ڈھانپنا ضروری ہے، جس میں کلائیوں کا چھپانا بھی شامل ہے۔ فقہ حنفی کے مطابق عورت کا پورا بدن سوائے چہرہ، دونوں ہتھیلیوں اور پاؤں کے ستر میں شامل ہے، لہذا کلائی کا کھلا رہنا نماز میں درست نہیں ہے۔

اگر کسی عورت کی کلائی کھلی رہی اور وہ ایک عضو ہے جس کا چھپانا واجب ہے، تو اس کی نماز مکروہ تحریمی ہوگی۔ البتہ اگر کلائی تھوڑی مقدار میں کھلی رہی اور فوراً ڈھک لیا گیا تو نماز ہو جائے گی، مگر بلا عذر پوری نماز اسی حالت میں پڑھنے سے نماز دہرانا ضروری ہوگا۔

حضرت امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وإذا صلت المرأة في ثوب يغطيها من رأسها إلى قدمها إلا الكفين لم تجز صلاتها، وعليها أن تستر كل شيء من بدنها إلا الوجه والكفين" (از لفتاوی الہندیہ، کتاب الصلاۃ، الباب السابع فیما یفسد الصلاۃ وما یکرہ فیھا، 1/55)۔

اسی طرح امام ابن عابدین شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"إذا ظهر من العورة قدر الدرهم في الصلاة على سبيل

الفرض ولم يغطه في الحال فإن صلاته تفسد" (رد المحتار علی الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب ستر العورۃ، 1/514)۔

لہٰذا، اگر کلائی کھلی رہی اور بغیر عذر کے اس کو ڈھانپنے کی کوشش نہیں کی گئی تو نماز فاسد ہوگی اور اس کا اعادہ کرنا لازم ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

شبینہ کا حکم

سوال: ہندوستان میں اس کا عام رواج ہے کہ رمضان المبارک کے مہینے میں 27 شب کو یا کسی ایک متعین رات میں چند حفاظ مل کر ایک رات میں قران پاک ختم کرتے ہیں جس کو شبینہ کہا جاتا ہے ایک صاحب نے ابن ماجہ کی حدیث جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نہیں جانتی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات میں پورا قران صبح تک کے پڑھا ہو۔ **عن عائشة قالت لا اعلم نبي الله صلى الله عليه وسلم قرأ القرآن كله حتى الصباح** (ابن ماجہ ص 407)۔ اس روایت سے شبینہ کا خلاف سنت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے ی کہ فقہ حنفی کی مستند و معتبر کتابوں کے حوالے سے بتلائیں کہ شبینہ درست ہے یا نہیں؟ فقط

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

شبینہ، یعنی ایک رات میں پورا قرآن ختم کرنا، اصل میں یہ مستحب عمل نہیں ہے اور فقہ حنفی میں اس کا ذکر نہیں ملتا کہ اس کو لازمی یا معمولی طور پر کسی مخصوص رات میں کیا جائے۔ تاہم، اگر چند حفاظ ایک رات میں قرآن ختم کرتے ہیں تو یہ اس شرط پر جائز ہو سکتا ہے کہ اس میں قرآن کی تلاوت تدبر اور خشوع کے ساتھ ہو اور تلاوت کی اصل روح متاثر نہ ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث جس کا ذکر کیا گیا ہے، اس میں واضح طور پر یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات میں پورا قرآن نہیں پڑھا، اور یہ دلیل اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ معمول کی صورت میں ایک رات میں پورا قرآن پڑھنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نہیں تھا۔

فقہ حنفی کی معتبر کتب میں اس مسئلے پر عمومی طور پر اس طرح کا ذکر نہیں ملتا کہ ایک رات میں قرآن ختم کرنا مسنون ہو، بلکہ عمومی تعلیمات یہ ہیں کہ قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر اور غور و فکر کے ساتھ پڑھنا افضل ہے۔ جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ قرآن کو سمجھ کر اور آہستہ آہستہ پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔

فقہی حوالہ جات:

۱ – ولا بأس أن يختم القرآن في شهر أو في شهرين ولايكون الترتيل في القرائة إلا بتدبر وتفكر" (المبسوط للسرخسی، ج1، ص42)

۲– ”الأصل فی القرائة أن تکون بترتیل وتدبر لقوله تعالی ورتل القرآن ترتیلا“ (الفتاوی الہندیۃ، ج1، ص49)

خلاصہ یہ ہے کہ شبینہ خلاف سنت ہے، بہتر یہ ہے کہ قرآن کو تدبر اور خشوع کے ساتھ پڑھا جائے اور ایک رات میں پورا قرآن ختم کرنے سے بچا جائے تا کہ قرآن کی تعلیمات کا صحیح فہم حاصل ہو۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

میدان جنگ میں قوس کے سہارے خطبہ دینا اور جمع میں عصا کے سہارے خطبہ دینے کی حکمت کیا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ابن ماجہ کی یہ حدیث ہے کہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا خطب فی الحرب خطب علی قوس واذا خطب فی الجمعة خطب علی عصا ابن ماجہ باب فی خطبة یوم الجمعه (ج:۱،ص342)۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا نہیں؟ دوسری بات یہ معلوم کرنی ہے کہ جب میدان جنگ میں آپ ہوتے تو قوس کے سہارے کھڑے ہوتے تھے اور جمعہ کا خطبہ دیتے تو عصا کے سہارے آپ خطبہ دیتے تھے، ان دونوں میں فرق کی وجہ کیا ہے؟

شراح حدیث کے کلام کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

ابن ماجہ کی مذکورہ حدیث "**ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا خطب فی الحرب خطب علی قوس واذا خطب فی الجمعة خطب علی عصا**" سند اور درایت دونوں کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ امام ابن ماجہ نے اس حدیث کو اپنی سنن (باب فی خطبۃ یوم الجمعہ) میں روایت کیا ہے، لیکن اس کی سند میں ایک راوی "محمد بن اسحاق" ہے، جو کہ اگرچہ ثقہ ہیں مگر "تدلیس" میں معروف ہیں، اور اس حدیث میں انہوں نے "عن" کے طریقہ سے روایت کی ہے جس کی وجہ سے حدیث ضعیف قرار دی گئی ہے۔

جہاں تک میدان جنگ اور جمعہ کے خطبے میں قوس اور عصا کے استعمال کا تعلق ہے، اس پر شراح حدیث نے مختلف آراء دی ہیں۔ علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ نے "عون المعبود" میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جنگ کی حالت میں قوس (کمان) کا استعمال قدرتی تھا کیونکہ وہ جنگ کا ایک اہم آلہ تھی اور میدان جنگ میں آپ ﷺ کا قوس کے ساتھ کھڑا ہونا ایک فطری امر تھا، جو کہ جنگ کی شدت اور اس کی مناسبت کو ظاہر کرتا ہے۔

جبکہ جمعہ کے خطبے میں عصا کا استعمال ایک علامت تھی، جو کہ خطبے کی اہمیت، وقار اور خطابت کے اعتبار سے موزوں تھا۔ عصا خطبہ جمعہ کے دوران وقار اور سنجیدگی کی علامت سمجھی جاتی تھی اور اس کا استعمال حکمت کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

لہٰذا، میدان جنگ میں قوس کا اور جمعہ کے خطبے میں عصا کا استعمال نبی اکرم ﷺ کی حکمت عملی اور مناسبت حال کے اعتبار سے تھا۔ میدان جنگ میں قوس کا استعمال جنگی ماحول کے مطابق اور خطبہ جمعہ میں عصا کا استعمال خطبے کی وقار اور سنجیدگی کی علامت کے طور پر کیا گیا۔

حوالہ جات:

- سنن ابن ماجہ، باب فی خطبۃ یوم الجمعۃ، حدیث نمبر 1105، جلد 1، صفحہ 342
- عون المعبود، جلد 3، صفحہ 390

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

جمعہ کے خطبہ میں سیاہ پگڑی کے استعمال کی حکمت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ابن ماجہ باب ماجاء فی خطبة یوم جمعه کی حدیث ہے: ان رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم یخطب علی المنبر وعلیه عمامة سودا (ابن ماجہ ج 1 صفحہ 342)۔ سوال یہ ہے کہ اس حدیث کی حیثیت کیا ہے؟ صحیح ہے یا نہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جمعہ کے دن کالی پگڑی کا جو انتخاب فرمایا اس کی حکمت اور فلسفہ کیا ہے؟ اس

سلسلے میں حدیث پاک کی شرح کرنے والے کیا لکھتے ہیں؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیا

آپ کا سوال دو حصوں پر مشتمل ہے:

۱- ابن ماجہ کی حدیث کی صحت

۲- جمعہ کے دن کالی پگڑی کے انتخاب کی حکمت وفلسفہ

۱- ابن ماجہ کی حدیث کی صحت:

اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ''باب ما جاء فی خطبۃ یوم جمعہ'' کے تحت روایت کیا ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ (ابن ماجہ، کتاب: إقامۃ الصلوات، باب: ماجاء فی خطبۃ یوم الجمعۃ، حدیث: 1095)۔

اس حدیث کی سند پر محدثین نے مختلف آراء کا اظہار کیا ہے۔ بعض محدثین نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے جبکہ بعض نے حسن یا قابل قبول کہا ہے۔

ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب ''التلخیص الحبیر'' میں اس حدیث کے راویوں کا ذکر کرتے ہوئے اسے ''حسن'' قرار دیا ہے:

قال ابن حجر: ''هذا الحديث حسن، قد روى من طرق متعددة'' (التلخیص الحبیر، ج2، ص60)

۲- جمعہ کے دن کالی پگڑی کے انتخاب کی حکمت وفلسفہ:

احادیث مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ سے مختلف مواقع پر مختلف رنگوں کی پگڑیوں کا استعمال ثابت ہے۔ جمعہ کے دن کالی پگڑی باندھنے کی حکمت کے بارے میں کوئی واضح اور مخصوص فلسفہ بیان نہیں کیا گیا، تاہم شارحین حدیث نے اس سے بعض حکمتیں مستنبط کی ہیں۔

امام سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''شرح سنن ابن ماجہ'' میں لکھا ہے کہ:

''کان رسول الله ﷺ یحب الألوان الداکنة، ولا سیما فی المناسبات الخاصة''۔

یعنی آپ ﷺ کو گہرے رنگ پسند تھے، خاص طور پر اہم مواقع پر۔

کالی پگڑی کو کسی مخصوص وجہ سے جمعہ کے دن پہننے کے بارے میں شارحین نے عمومی طور پر یہ ذکر کیا ہے کہ یہ نبی ﷺ کی سنت مبارکہ ہے اور مسلمانوں کے لیے عزت اور وقار کی علامت بھی ہو سکتی ہے۔

'مرقات المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح' میں ملا علی قاری نے بھی یہی بات بیان کی ہے کہ:

''والعمامة السواداء کانت رمزاً للعزة والوقار'' (مرقات المفاتیح، ج 5، ص 321)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

نوافل وسنن میں خلل ڈالنے کا حکم

سوال: حضرت مفتی صاحب معلوم یہ کرنا ہے کہ نماز کے بعد تبلیغی جماعت والے بولتے ہیں کہ تھوڑی دیر ٹھہریے ایمان اور دین کی بات ہوگی تو جب تک آدمی کی نوافل یا سنتیں ختم نہیں ہوتیں سامنے ایک آدمی کھڑے ہو جاتے ہیں، اوران کے جو جماعت والے ہوتے ہیں وہ نماز پڑھتے ہی وہیں کے وہیں تھوڑا گھوم کے بیٹھ جاتے ہیں نماز پڑھنے والے کے سامنے۔تو کیا اس طرح سے بیٹھنا جائز ہے؟ اور نمازیوں کے سامنے اس طرح سے کھڑے ہو جانا اور بولنا آجاؤ بھائی آجاؤ بیٹھ جاؤ آجاؤ بھائی آجاؤ بیٹھ جاؤ دین کی بات ہوگی تعلیم ہوگی تو کیا اس طرح سے کھڑا ہونا بات کرنا جائز ہے؟ جس سے نوافل وسنن پڑھنے والوں کی نماز میں خلل ہوتا ہے۔قران وحدیث اور فقہ حنفی کی مستند ومعتبر کتابوں کے حوالے سے جواب بتلائیں مہربانی ہوگی۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

آپ کا سوال بہت اہم اور قابل توجہ ہے۔نماز کے بعد ایسی کوئی چیز کرنا جو نمازیوں کے خشوع وخضوع میں خلل ڈالے، یا ان کی نوافل اور سنن کو متاثر کرے، شرعاً پسندیدہ نہیں ہے۔اس معاملے کو قرآن وحدیث اور فقہ حنفی کی معتبر کتابوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

قرآن مجید کی ہدایت:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

"وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي" (طٰہٰ:14)۔

یعنی نماز کو خشوع اور اللہ کے ذکر کے ساتھ قائم کرو۔

یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ نماز کے دوران کسی بھی قسم کا بیرونی خلل پیدا نہ کیا جائے، کیونکہ نماز کا مقصد اللہ کی یاد میں مشغول ہونا ہے۔ اسی لیے، جو کام خشوع میں خلل ڈالنے کا باعث بنے، وہ مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔

حدیث مبارکہ کی روشنی میں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ فَإِنَّهُ يُنَاجِي رَبَّهُ" (صحیح بخاری:405)۔

یعنی جب تم میں سے کوئی نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے مناجات کر رہا ہوتا ہے۔

یہ حدیث اس بات کو واضح کرتی ہے کہ نمازی کی مکمل توجہ اللہ کی طرف ہونی چاہیے اور کسی قسم کی دنیوی بات یا عمل سے اس کی نماز میں خلل ڈالنا درست نہیں۔

فقہ حنفی کے اصول:

فقہ حنفی میں یہ اصول واضح ہے کہ ہر وہ عمل جو نماز میں خشوع وخضوع کو کم

کرے، یا کسی نمازی کو اس کی عبادت سے روکنے کا سبب بنے، مکروہ تحریمی ہے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

"وَيُكْرَهُ كُلُّ مَا يُشَوِّشُ عَلَى الْمُصَلِّي تَفْكِيرَهُ أَوْ خُشُوعَهُ كَالصَّوْتِ الْعَالِي وَالْكَلَامِ كَأَنْ يَكُونَ جَالِسًا وَيَجْهَرُ بِالذِّكْرِ أَوْ الْقِرَائَةِ" (ردالمحتار، جلد 1، صفحہ 651)۔

یعنی نماز میں نمازی کے خشوع وخضوع میں خلل ڈالنے والا ہر عمل مکروہ ہے، جیسے اونچی آواز میں بات کرنا یا ذکر کرنا۔

خلاصہ جواب:

نماز کے بعد فوراً ایمان و دین کی بات شروع کرنا جبکہ لوگ نوافل اور سنن پڑھ رہے ہوں، اور اس دوران نمازیوں کے سامنے بیٹھنا یا بولنا کہ "آ جاؤ بھائی آ جاؤ بیٹھ جاؤ" وغیرہ، یہ عمل مکروہ ہے۔ کیونکہ اس سے نمازیوں کی نماز میں خلل آتا ہے، اور خشوع وخضوع متاثر ہوتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ایسی بات چیت یا تبلیغی سرگرمی نمازیوں کے نوافل اور سنن مکمل کرنے کے بعد کی جائے تاکہ ان کی عبادت میں کوئی خلل نہ ہو۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿باب المسافر﴾

دو بیویوں میں سے سفر میں کس کو لے جائے؟

سوال: ایک شخص کی دو بیویاں ہیں اور دونوں کے ساتھ شوہر رہتا ہے، اب اس کو باہر کا ایک سفر درپیش ہے، تو سوال یہ ہے کہ سفر میں دونوں کو لے جانا ضروری ہے یا کسی ایک کو لے جا سکتا ہے؟ اگر کسی ایک کو لے جائے تو اس کے لیے انتخاب کا شرعی طریقہ کیا ہے؟ فقہ حنفی کی معتبر و مستند کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامدا ومصلیا

فقہ حنفی کے مطابق اگر ایک شخص کی دو بیویاں ہیں اور وہ سفر پر جانا چاہتا ہے، تو شرعی طور پر یہ ضروری نہیں کہ وہ دونوں بیویوں کو ساتھ لے جائے، وہ کسی ایک بیوی کو ساتھ لے جا سکتا ہے۔

اس مسئلے میں فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں درج ذیل اصول موجود ہیں:

۱- کتاب الخانیہ:

”وإذا سافر الرجل وأراد أن يأخذ معه إحداهما لم يكن عليه

منها حرج" (الکتاب الخالیۃ، ج۲، ص۱۲۹)۔

۲-الدرالمختار:

"**و يجوز له أن يسافر بإحدى النساء وليس عليه تسوية**" (الدرالمختار، ج۲، ص۴۲۵)۔

۳-الفتاوی الہندیۃ:

"**يجوز للرجل أن يسافر ببعض النساء ويترك الباقية**" (الفتاوی الہندی، ج۱، ص۱۹۰)۔

انتخاب کا شرعی طریقہ:

عدل وانصاف اگر شوہر کسی ایک بیوی کو ساتھ لے جانا چاہتا ہے، تو اسے انصاف اور عدل کا خیال رکھنا چاہیے، یہ بہتر ہے کہ بیوی کو انتخاب کرنے میں ان کے حقوق اور حالات کو مدنظر رکھا جائے۔

مناسبت:

سفر کے مقصد اور بیویوں کی حالت (جیسے صحت، ضرورت وغیرہ) کو مدنظر رکھتے ہوئے انتخاب کیا جائے۔

شفقت:

بیویوں کے ساتھ شفقت اور ان کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے سفر کے فیصلے کو انجام دیا جائے۔

یہ اصول اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ سفر کے دوران بیویوں کے حقوق اور حالات کا خیال رکھتے ہوئے فیصلہ کیا جائے اور کسی ایک بیوی کو لے جانا شرعاً جائز ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

وطن اصلی، اقامت، عزیمت کے احکام

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

۱-وطن اقامت کس کو کہتے ہیں؟ اور کیا وطن اقامت دو ہو سکتے ہیں؟

۲-وطن اصلی کس کو کہتے ہیں؟ اور کیا وطن اصلی دو ہو سکتے ہیں؟

۳-وطن غربت کس کو کہتے ہیں؟

۴-اگر کوئی مسافر حالت سفر میں رباعی نماز دو رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھ لے خواہ سہواً ہو یا عمداً تو اس کی نماز کا کیا حکم ہے؟

جواب: الجواب و باللہ التوفیق:

۱-وطن اقامت اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان پندرہ دن یا اس سے زائد ٹھہرنے کی نیت کرے مستقل قیام کی نیت نہ ہو، فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ وطن اقامت دو یا چند نہیں ہو سکتے کیونکہ وطن اقامت، وطن اصلی، وطن اقامت، سفر، تینوں کے ذریعہ باطل ہو جاتا ہے۔ **اما وطن الاقامة فهو الوطن الذى يقصد المسافر الاقامة فيه وهو صالح لها نصف شهر** (البحر الرائق ۲/۲۳۹،

مستفاد فتاوی محمودیہ ۷/۴۹۵، تخریج تعلیق)۔

و وطن الاقامة هو موضع نوی ان یستقر فیه خمسة عشر یوما أو اکثر من غیر ان یتخذه مسکنا (شرح الوقایہ ۱/۱۹۷)۔

۲-وطن اصلی وہ جگہ ہے جہاں انسان کی پیدائش ہوئی ہو یا وہ جگہ جہاں اس نے شادی کی ہو اور وہیں مستقل قیام کی نیت ہو، جی ہاں وطن اصلی دو یا اس سے زائد ہو سکتے ہیں جیسا کہ فقہاء عظام کی عبارات سے مفہوم و مستفاد ہوتا ہے۔

الوطن الاصلی هو وطن الانسان فی بلدة اخری اتخذها دار او توطن مع اهله و ولده و لیس من قصده الارتحال عنها ، بل التعیش بها و هذا الوطن یبطل بمثله لا غیر وهو ان یتوطن فی بلدة اخری و ینتقل لاهل الیها فیخرج الاول من ان یکون وطنا اصلیا حتی لو دخل مسافرا لا یتم قیدنا بکونه انتقل عن الاول باهله لانه لو لم ینتقل بهم و لکن استحدث اهله فی بلدة اخری فالاول لم یبطل و یتم فیها الخ (البحر الرائق ۱/۱۳۶، وکذا فی تبیین الحقائق ۱/۵۱۷، فتاوی محمودیہ تخریج تحقیق و تعلیق ۷/۴۹۷، احسن الفتاوی ۴/۱۰۲)۔

لان الاصل ان الوطن الاصلی تبطل بمثله دون السفر و وطن الاقامة تبطل بمثله و بالسفر و بالاصلی (ہدایہ ۱/۱۴۷)۔

۳-وطن غربت جس کو وطن سکنی بھی کہتے ہیں وہ جگہ ہے جہاں مسافر پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کی نیت کرے، **و وطن السکنی وهو المکان الذی ینوی ان یقیم فیه اقل من خمسة عشر یوما** (فتاوی ہندیہ ۱/۱۴۲، بدائع الصنائع ۱/۲۸۰)۔

۴-اگر کوئی مسافر شرعی چار رکعت والی نمازوں میں مقیم کی اقتداء کرے تو چار رکعت پڑھے گا اور اگر مسافر تنہا پڑھے گا تو ضروری ہے کہ دو رکعت ہی پڑھے کیونکہ مسافر کے لئے قصر احناف کے نزدیک واجب ہے، بنابریں اگر کوئی مسافر رباعی نمازوں میں چار رکعت پڑھ لے خواہ سہوا ہو یا عمداًاور دو رکعت پر قعدہ کر لے، پھر تاخیر سلام کی وجہ سے سجدہ سہو کر لے تو اس کی نماز درست ہوگئی، البتہ عمداً کی صورت میں گنہگار ہوگا، لیکن بھول چوک کی صورت میں کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر مسافر نے قعدہ اولی نہ کیا یا قعدہ اولی تو کیا لیکن آخر میں سجدہ سہو نہ کیا تو تاخیر واجب کی وجہ سے دوبارہ نماز پڑھنی ہوگی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر مسافر نے قعدۂ اولی کر لیا اور آخر میں سجدہ سہو کر لیا تو اس کی نماز درست ہوگئی، پہلی دو رکعت فرض ہوگی اور بعد کی دو رکعتیں نفل ہوں گی، اور اگر قعدہ اولیٰ نہیں کیا تو نماز باطل ہوگئی۔

فلو اتم مسافر إن قعد فی العقدة الاولی تم فرضه و لكنه اساء لو عامدا لتاخير السلام (درمختار مع الشامی، زکریا ۲/۶۰۹)۔

فان صلی اربعا و قعد فی الثانية قدر التشهد اجزاته والاخريان نافلة و يصير مسيئا لتاخير السلام و إن لم يقعد فی الثانية قدرها بطلت لاختلاط النافلة بها قبل اكمال اركانها (ہدایہ ۱/۱۴۶، کتب خانہ رشیدیہ) **كل صلوة اديت مع كراهة التحريم تجب اعادتها** (درمختار، زکریا ۲/۶۰۹، کتاب النوازل ۵/۴۶۴)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿باب الجمعه﴾

دو فرقوں میں اختلاف کی صورت میں جمعہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارمیں۔ایک گاؤں ہے جہاں بریلوی اور دیوبندی عقیدہ کے لوگ رہتے ہیں، لیکن دونوں فرقہ میں اتنی شدت پیدا ہوگئی ہے کہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کے امام کے پیچھے نماز پڑھنے کو تیار نہیں ہے اور نہ ہی کوئی فرقہ مسجد چھوڑنے کو تیار ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس صورت میں جمعہ کی نماز کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟ تا کہ دونوں فرقہ میں اختلاف نہ ہو۔فقط

جواب: الجواب و بالله التوفیق:

اسلام نے اتحاد واتفاق پر بڑا زور دیا ہے اور انتشار واختلاف کی مذمت کی ہے، مسلکی اختلاف میں شدت برتنا قطعا مناسب نہیں دونوں فریق کو چاہئے کہ مصالحت کی راہ اختیار کریں اور مل جل کر ایک امام کے پیچھے نماز جمعہ ادا کریں بشرطیکہ اس بستی میں شرائط جمعہ موجود ہوں، اگر مصالحت کی صورت نہ بن سکے تو ایک فریق دوسری مسجد میں جا کر نماز جمعہ ادا کریں، ایک مسجد میں جماعت ثانیہ نہ کریں اور اگر وہاں

دور دور تک کوئی مسجد نہ ہو تو کسی مناسب جگہ پر جمعہ ادا کریں، اگر اس طرح کوئی مناسب جگہ فراہم نہ ہو اور لوگوں کے جمعہ چھوڑنے یا چھوٹنے کا قوی اندیشہ ہو تو اسی مسجد میں جمعہ کی جماعت ثانیہ کرلیں اور رب العالمین سے دعاء کریں کہ لوگوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو، اختلاف انتشار ختم ہو، ارشاد باری ہے:"ولا تنازعوا فتفشلوا" الخ (سورہ انفال جزء ۱، پ:۴۶، والصلح خیر، سورہ نساء جزء آیت ۱۸)۔

و تودی فی مصر واحد بمواضع کثیرة مطلقا و علیه الفتوی (درمختار، دار الکتاب، ج ۱، ص: ۱۱۰، الفتاوی الہندیہ، ج ۱، ص: ۱۴۵)۔

ولو صلی خلف مبتدع اوفاسق فهو محرز ثواب الجماعة لکن لاینال مثل ماینال خلف تقی (فتاوی ہندیہ، ج ۱، ص ۸۴)۔

و یکره تحریما تکرار الجماعة باذان و إقامة فی مسجد و فی الامیة تحته: و مقتضی هذا الاستدلال کراهة التکرار فی مسجد المحلة ولو بدون اذان و یویدهٔ ما فی الهدایه، لو دخل جماعة المسجد بعد ما صلی فیه أهله یصلون وحدانا وهو ظاهر الروایة (درمختار مع الشامی، زکریا، ج ۲، ص ۲۸۹)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿باب الجنائز﴾

جنازہ کی نماز میں تیسری تکبیر کے بعد سلام پھیرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ زید نے جنازہ کی نماز پڑھائی لیکن چوتھی تکبیر کے بجائے تیسری تکبیر کے بعد اس نے سلام پھیر دیا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ جنازہ کی نماز ہوئی یا نہیں۔امید کہ تشفی بخش جواب سے نوازیں گے۔

جواب: الجواب حامداً ومصلیاً

نماز جنازہ میں چار تکبیرات اور قیام فرض ہیں، اور فرض کے چھوڑ دینے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں چوتھی تکبیر چھوٹ جانے کی وجہ سے نماز فاسد ہوگئی، دوبارہ نماز جنازہ پڑھنی ہوگی۔

الامام إذا اقتصر على ثلثة فنسدت فيما يظهر و إذا فنسدت على الامام فسدت على الماموم لترك ركن من اركانها (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح دار الکتاب دیوبند، ص:۵۸۷)

و صلوۃ الجنازۃ اربع تکبیرات ولو ترک واحدۃ لم تجز صلوته (ہکذافی الکافی، ہندیہ، ج:۱،ص:۱۶۴)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

حضرت علی کا حضرت فاطمہ کو غسل دینے کا حکم

سوال: بیوی کے انتقال پر شوہر اسے غسل نہیں دے سکتا تو پھر حضرت علی نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل کیوں کر دیا؟ لکھا ہے "**وغسلها علی**" یعنی حضرت علی نے ان کو غسل دیا تو اسکی کیا توجیہ ہوسکتی ہے؟ ارشاد فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیا

فقہ حنفی کے مطابق شوہر اپنی بیوی کو غسل نہیں دے سکتا، کیونکہ نکاح کا تعلق بیوی کی وفات کے بعد ختم ہوجاتا ہے، اور ایسی حالت میں شوہر کے لیے اپنی بیوی کو دیکھنا یا اسے چھونا جائز نہیں رہتا۔ اس حکم کی بنیاد بعض احادیث اور فقہاء کی آراء پر ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دینا ایک خاص اور استثنائی واقعہ ہے، جو عام حالات پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ علماء نے اس مسئلے کی توجیہات مختلف طریقوں سے کی ہیں:

۱۔ بعض علماء کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو

غسل دیا لیکن اس واقعہ کی حقیقت قطعی طور پر ثابت نہیں ہے، اور بعض روایات کے مطابق یہ عمل حضرت علی کے بجائے حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے انجام دیا تھا۔

۲- بعض دیگر علماء کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دینا ان کی خصوصی اجازت پر مبنی تھا چوں کہ حضرت فاطمہ اہلِ بیت میں سے تھیں۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿کتاب الزکاۃ﴾

حولان حول کے بعد زکوۃ نکالنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ زید صاحب نصاب ہے اور اس کے مال پر حولان حول یعنی سال مکمل ہو چکا ہے تو کیا حولان حول کے بعد مال کا حساب کر کے فوراً زکوۃ نکالنا ضروری ہے؟ یا کیف ما اتفق حسب سہولت وضرورت کبھی بھی زکوۃ کی رقم مال نصاب سے نکالی جاسکتی ہے؟

امید ہے کہ جواب باصواب سے سرفراز فرما کر ممنون ومشکور ہوں گے۔

جواب: الجواب حامدا و مصلیا

حولان حول کے بعد مال نصاب سے زکوۃ کے نکالنے کے سلسلہ میں حضرات فقہاء احناف کا اختلاف ہے۔ اکثر حضرات حولان حول کے بعد فوراً زکوۃ کی ادائیگی کو واجب قرار دیتے ہیں اور دلائل کی روشنی میں انہی حضرات کا قول راجح معلوم ہوتا ہے، اگر چہ دوسرے بعض فقہاء حنفی تاخیر کی گنجائش کے بھی قائل ہیں۔

چنانچہ جو حضرات فوری ادائیگی زکوۃ کے وجوب کے قائل ہیں ان میں امام

کرخیؒ بھی ہیں۔

اسی طرح صاحب منتقی بھی وجوب علی الفور کے قائل ہیں، چنانچہ انہوں نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر صاحب نصاب مقدار کوادا نہ کرے اور دوسرا سال اس پر گزر جائے تو وہ شخص گنہگار ہوگا۔

اسی طرح حضرت امام محمد علیہ الرحمہ سے منقول ہے کہ جس پر زکوۃ واجب ہو اور وہ زکوادانہ کرے تو وہ مردود الشہادۃ ہے۔

نیز حضرت امام محمد علیہ الرحمہ ہی سے یہ بھی منقول ہے کہ وجوب زکوۃ کے بعد ادائیگی زکوۃ میں تاخیر جائز نہیں ہے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام محمد علیہ الرحمہ حولان حول کے بعد فوراً زکوۃ کی ادائیگی کے قائل ہیں۔

فتاوی ہندیہ میں اس کی صراحت ہے کہ سال مکمل ہوجانے کے بعد زکوۃ کی ادائیگی فوراًواجب ہےاور تاخیر باعث گناہ ہے۔

امام فرید الدین نے حاکم شہید کے حوالہ سے حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد دونوں حضرات کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حولان حول کے بعد فورا زکوۃ کی ادائیگی واجب ہے۔

اور صاحب خلاصۃ الفتاوی نے حضرات صاحبین کے قول کو واضح یعنی مفتی بہ قرار دیا ہےاور صاحب فتاوی خانیہ نے اس کی صراحت کی ہے کہ حولان حول کے بعد ادائیگی زکوۃ میں تاخیر جائز نہیں ہے۔

بلکہ صاحب فتاوی ظہیریہ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ حولان حول کے بعد جو شخص فوراً زکوۃ ادا نہ کرے تو امام المسلمین کو یہ حق ہے کہ اس کو جیل میں ڈال دے اور اس کی تعزیر کرے۔

صاحب درمختار نے وجوب علی الفور والے قول کو مفتی بہ قرار دیتے ہوئے وعلیہ الفتوی کی صراحت کی ہے۔

اور وجوب علی الفور کی علت غائیہ بیان کرتے ہوئے اس کی صراحت کی ہے کہ وجوب زکوۃ کی حکمت حاجت منداور فقراء کی ضرورت کی تکمیل ہے، اگر مزکی فوراً اس کوادا نہیں کرے گا تو فقراء اور ضرورت مندوں کی ضرورتوں کی تکمیل نہیں ہو پائے گی اور ایجاب زکوۃ کا مقصد فوت ہو کر رہ جائے گا۔

علامہ شامی نے بھی اس کی صراحت کی ہے کہ زکوۃ اپنی ذات کے اعتبار سے فرض ہے اور حولان حول کے بعد اس کا فورا نکالنا واجب ہے، حضرات فقہاء کرام کے ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ زکوۃ کی ادائیگی سال مکمل ہو جانے کے بعد فورا واجب ہے۔ لہٰذا بلا عذر شرعی زکوۃ کی ادائیگی میں ٹال مٹول یا تاخیر باعث گناہ ہے۔

نیز مال کی جتنی مقدار میں فقراء وحاجت مندوں کا حق متعلق ہو جائے اس کو اصل مال سے نکال کر الگ کر دینا چاہے اور اس کو اپنے مال کی رنگ میں باقی نہیں رکھنا چاہئے، چونکہ اس کا مالک اب صاحب مال نہیں ہے بلکہ فقراء وحاجت منداس کے مالک ہو چکے ہیں۔

اگر مالک اس مال کو جس سے فقراء اور حاجت مندوں کا حق وابستہ ہو چکا ہے اگر اپنے خالص مال کی رولنگ میں شامل کر کے نفع حاصل کرے گا تو اس نفع کا استعمال بھی مالک کے لئے درست نہیں ہے بلکہ اس کے حقدار بھی فقراء اور حاجت مند ہی ہیں۔

مسئلہ چونکہ بہت دقیق اور علمی اور فقہی ہے اس لئے اس کو سمجھنے کے لئے وسعت ذہن اور دقت نظر کی ضرورت ہے۔

كما قال الإمام الكاساني: ذكر الكرخي أنها على الفور، وذكر في "المنتقى" ما يدل عليه فإنه قال: إذا لم يؤد الزكاة حتى مضى حولان فقد أساء و أثم و لم يحل له ما صنع، وعليه زكاة حول واحد، وعن محمد: إن من لم يؤد الزكاة لم تقبل شهادته، وروى عنه أن التأخير لا يجوز، وهذا نص على الفور (بدائع الصنائع:۲/۷۷، ط مکتبۃ زکریا دیوبند)۔

و في الهنديه: وتجب على الفور عند تمام الحول، حتى يأثم بتأخيره من غير عذر (الہندیۃ: المجلد الأول: ۲۳۲، ط: مکتبۃ زکریا دیوبند)۔

وقال الإمام فريد الدين عالم بن العلاء: ذكر الحاكم الشهيد في المنتقى أن وجوبها على الفور عند ابى يوسف و محمد، و في الخلاصة: وهو الأصح، وعن محمد أن من لم يؤد الزكاة. وفي الثانية وأخر من غير عذر، لا تقبل شهادته، وأن التأخير لا يجوز، وفي الظهيرية: إذا وقف عليه الإمام عزره و حبسه و طالبه، وفي الخانية:

فـرق مـحـمـد بين الحج و الزكاة فقال: لا يـأثـم بتـأخير الحج و يأثم بتأخير الزكاة (الفتاوی التاتارخانیۃ: ۱۳۵/۳)۔

و فـي الـدر الـمختار: و قيل فورى أى واجب على الفور و عليه الـفتوى كما فى شرح الوهبانية، فيأثم بتأخيرها بلا عذر، وترد شهادته، لأن الأمـر بـالـصـرف إلـى الفقير معه قرينة و هى أنه لدفع حاجته و هى مـعـجـلة. فـمتـى لم تجب على الفور لم يحصل المقصود من الإيجاب على وجه التمام (الدرالمختار، الجزء الثانی ۲۷۱-۲۷۳، طابع ایم سعید کمپنی پاکستان)۔

و فـى الشـامية: فتكون الزكاة فريضة وفوريتها واجبة، فيلزم بتأخيره من غير ضرورة الإثم (ردالمحتار، الجزء الثانی: ۲۷۲)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿کتاب الصوم﴾

روزہ کی حالت میں گرم بھاپ لینے کا حکم

سوال: اگر کوئی حالت روزہ میں کمبل یا چادر کے اندر سے گرم پانی کا بھاپ لے تو اسکا روزہ ٹوٹے گا یا نہیں؟

فقہ حنفی کی معتبر اور مستند کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

الجواب حامداً ومصليا

حالت روزہ میں کمبل یا چادر کے اندر سے گرم پانی کا بھاپ لینا، اگر وہ بھاپ جسم کے اندرونی حصے یعنی حلق یا پیٹ میں پہنچے تو اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا، کیونکہ فقہ حنفی کے اصول کے مطابق کوئی بھی چیز جو قابل احتراز ہو اور وہ روزہ دار کے جسم کے اندر پہنچے تو اس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب بدائع الصنائع میں اس کی وضاحت موجود ہے:

”وإن أدخل حلقه الدخان فسد صومه لأنه يمكن التحرز عنه“

(بدائع الصنائع، جلد 2، صفحہ 93)۔

اسی طرح فتاوی ہندیہ میں بھی ذکر ہے:

"إذا أوصل شيئا إلى جوفه أو دماغه ...سواء كان في جوفه أو في دماغه فسد صومه" (فتاوی ہندیہ، جلد 1، صفحہ 200)۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر بھاپ قابلِ احتراز ہو اور وہ اندر چلی جائے تو اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿کتاب الحج﴾

ایام حج میں منیٰ میں جمعہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین، مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ ''منیٰ'' پورے سال جنگل و بیابان کی طرح ویران رہتا ہے، لیکن ایام حج میں لاکھوں حجاج کے ''منیٰ'' میں جمع ہونے کی وجہ سے ایک گونہ اس جگہ کو شہریت حاصل ہوجاتی ہے اور ضرورت کی ساری چیزیں وہاں میسر ہوتی ہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ قیام منیٰ کے دوران اگر جمعہ کا دن آجائے تو حجاج منیٰ میں جمعہ کی نماز ادا کریں گے یا ظہر کی۔ امید کہ جواب سے سرفراز فرمائیں گے۔

جواب: الجواب و باللہ التوفیق:

حج کے ایام میں ''منیٰ'' کو شہر کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے اور شہر میں نماز جمعہ ادا کرنا جائز ہے، لہٰذا حجاج کرام قیام منیٰ میں جمعہ کے دن جمعہ کی نماز ادا کریں گے، بشرطیکہ بادشاہ وقت یا امیر موجود ہو، قیام جمعہ کے لئے موسم حج میں امیر الحجاج کی موجودگی کافی نہیں، الا یہ کہ بادشاہ وقت یا امیر مکہ کی طرف سے ان کو اجازت قیام جمعہ

کی مل چکی ہو۔

و جازت الجمعة بمنی فی الموسم فقط لوجود الخلیفة و امیر الحجاز اوالعراق او مکة و وجود الاسواق والسکک وکذا کل ابنیة نزل بها الخلیفة لا تجوز لامیر الموسم لقصور ولایته علی الحج. (الدرالمختار مع الشامی، ج:۲،ص:۱۶، مکتبہ اشرفیہ، وکذا فی الہدایہ، ج:۱،ص:۱۴۸)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

بغیر احرام کے میقات سے گزرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ ایک خاتون مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ جاتے ہوئے میقات سے بغیر احرام کے گزر گئی، چونکہ وہ حالت حیض میں تھی اس لئے اس نے سمجھا کہ مجھ کو احرام نہیں باندھنا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس کو کیا کرنا ہوگا۔ اس کا حل مطلوب ہے۔ فقط والسلام

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

بغیر احرام میقات سے تجاوز کرنے کی وجہ سے دو چیزیں ایک ساتھ لازم ہو چکی ہیں: (۱) دم یعنی قربانی واجب ہوگئی (۲) باہر سے آنے والوں کے لئے حق مکہ

کی وجہ سے حج یا عمرہ واجب ہوجاتا ہے، اگر حج کا زمانہ ہے تو حج کرے اور اگر حج کا زمانہ نہ ہو تو عمرہ کرے، کیونکہ عمرہ کا زمانہ ہمیشہ ہے، لہٰذا خاتون پر دم اور حج یا عمرہ کی ادائیگی لازم ہے۔

ومن دخل مكة أو الحرم بلا احرام عليه احد النسكين فلو احرم به بعد تحول السنة أو قبله من مكة أو خارجها داخل المواقيت أجزاه و عليه دم المجاوزة غنية الناسک (قدیم ص:۳۱، جدید کراچی، ص:۶۲)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

ہندوستان سے عمرہ کے ارادہ سے جانے والا 20 دن جدہ میں قیام کرے تو کیا حکم ہے

سوال : ایک شخص ہندوستان سے عمرے کے ارادے سے جاتا ہے لیکن وہ جدہ میں 20 دن مستقل قیام کرتا ہے اور وہاں سے مکہ جاکر عمرہ کرکے پھر جدہ واپس آجاتا ہے اور جدہ سے روزانہ وہ مکہ جاتا ہے حالانکہ اس کا مستقل قیام جدے میں نہیں ہے بلکہ ہندوستان سے عمرے کی نیت سے گیا ہے اس صورت میں جب روزانہ وہ مکہ جائے گا تو اس پر احرام باندھ کر جانا ضروری ہے یا نہیں؟ اور روزانہ عمرہ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ فقہ حنفی کی مستند اور معتبر

کتابوں کی عبارت کے حوالے کے ساتھ بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ شخص جو ہندوستان سے عمرہ کی نیت سے آیا ہے اور اس کا مستقل قیام جدہ میں ہے، اس پر مکہ مکرمہ جانے کے لیے احرام باندھنے کا حکم اس کے سفر کی نوعیت پر منحصر ہے۔

احرام باندھنے کا حکم:

فقہ حنفی کے مطابق، اگر کوئی شخص میقات سے باہر رہائش پذیر ہو اور عمرہ یا حج کی نیت نہ ہو تو اس کے لیے مکہ جانے کے لیے احرام باندھنا ضروری نہیں ہے۔ لیکن اگر مکہ جانے کی نیت عمرہ کرنے کی ہو تو احرام باندھنا واجب ہوگا۔

آپ کے بیان کے مطابق، چونکہ وہ شخص ہندوستان سے عمرے کی نیت سے آیا ہے اور جدہ میں مستقل قیام کر رہا ہے، لہٰذا اگر وہ مکہ روزانہ جاتا ہے مگر عمرہ کی نیت کے بغیر، تو اس پر احرام باندھنا ضروری نہیں ہے۔ لیکن اگر ہر دفعہ مکہ جانے کی نیت عمرہ کرنے کی ہے تو احرام باندھنا لازم ہوگا۔

روزانہ عمرہ کرنے کا حکم:

روزانہ عمرہ کرنا واجب یا ضروری نہیں ہے بلکہ یہ ایک اختیاری عمل ہے۔ فقہ حنفی کے مشہور فتاویٰ کی کتب جیسے "فتاویٰ شامی" اور "البحر الرائق" میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ بار بار عمرہ کرنا باعثِ ثواب ہے، لیکن یہ فرض یا واجب نہیں ہے۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

"ویستحب الا کثر من عمرة فی العام" (شامی، کتاب الحج، باب الإحرام)۔

یعنی سال میں ایک عمرہ سے زیادہ عمرے کرنا مستحب ہے لیکن ضروری نہیں۔

لہٰذا، مذکورہ شخص اگر چاہے تو عمرہ کرسکتا ہے لیکن یہ روزانہ کرنا ضروری نہیں ہے۔ اگر وہ عمرہ نہیں کرتا، تب بھی کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

حدیبیہ جانے کے بعد واپسی پر عمرہ لازم ہوتا ہے یا نہیں؟

سوال: السلام علیکم مفتی صاحب ایک عمرہ کرنے والے مکہ سے فون کیے تھے وہ لوگ مکہ موجود ہیں پوچھ رہے تھے کہ حدیبیہ اگر ہم جاتے ہیں تو کیا وہاں سے عمرہ لازم ہوجاتا ہے یا صرف زیارت کی نیت سے جاکر واپس آسکتے ہیں فقہ حنفی کی معتبر ومستند کتابوں کے حوالہ سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

آپ کے سوال کے جواب میں، فقہ حنفی کے اصولوں کی روشنی میں اگر کوئی شخص مکہ مکرمہ میں مقیم ہو اور وہ حدودِ حرم سے باہر کسی مقام پر، جیسے کہ حدیبیہ، زیارت کے ارادے سے جائے تو اس پر عمرہ لازم نہیں ہوتا۔ یعنی وہ بغیر احرام کے صرف زیارت کی نیت سے جاسکتا ہے اور واپس آسکتا ہے۔ عمرہ صرف اس وقت واجب ہوتا

ہے جب کوئی شخص مکہ مکرمہ سے حدودِ حرم کے باہر جا کر عمرہ کرنے کی نیت سے احرام باندھے اور پھر واپس آئے۔

فقہ حنفی کی مستند کتاب ''فتاویٰ عالمگیری'' میں اس مسئلہ کو واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:

''وإذا خرج إلى الحل لحاجة بغير نية العمرة لا يلزمه شيء وهو قولهما وهو الصحيح'' (الفتاوی الہندیہ، کتاب المناسک، الباب الرابع فی العمرۃ، ج 1، ص 233)

ترجمہ: اگر کوئی شخص حاجت کی وجہ سے بغیر عمرہ کی نیت کے حِل (حدود حرم سے باہر) چلا جائے تو اس پر کچھ لازم نہیں ہوگا اور یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا موقف ہے، اور یہی صحیح ہے۔

اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص مکہ مکرمہ سے باہر حدود حرم سے صرف کسی حاجت یا زیارت کے لیے جاتا ہے اور عمرہ کی نیت نہیں کرتا تو اس پر عمرہ واجب نہیں ہوگا۔

لہٰذا، آپ لوگ حدیبیہ زیارت کے لئے جا سکتے ہیں اور وہاں سے واپس آ سکتے ہیں بغیر عمرہ کے احرام کے، بشرطیکہ وہاں جانے کا مقصد صرف زیارت ہو، نہ کہ عمرہ۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿کتاب النکاح﴾

حلالہ کی شرط پر نکاح کا حکم

سوال: ایک شخص کے پاس ایک عورت کو لے جایا گیا اور اس سے کہا گیا کہ اس کو حلالہ کے لیے لایا ہوں۔ چنانچہ اس شخص نے اس سے نکاح کر لیا اور اس میں حلالہ کی شرط لگائی، تو اب سوال یہ ہے کہ حلالہ کی شرط لگانا اور حلالہ کے بعد طلاق دینا درست ہے یا نہیں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس سے حلالہ نہیں ہوتا۔ فقہ حنفی کی مستند اور معتبر کتابوں کے حوالوں سے اس کا جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیا

فقہ حنفی کے مطابق اگر نکاح کرتے وقت اس بات کی نیت یا شرط ہو کہ نکاح صرف حلالہ کے مقصد کے لیے کیا جا رہا ہے اور بعد میں طلاق دی جائے گی، تو یہ نکاح مکروہ تحریمی ہے۔ اس طرح کا نکاح شریعت میں پسندیدہ نہیں ہے، لیکن اگر نکاح کے بعد شوہر نے بیوی کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کر لیے اور پھر طلاق دی تو اس صورت میں یہ عورت پہلے شوہر کے لیے حلال ہو جائے گی۔

اس مسئلے کی وضاحت درج ذیل کتب میں ملتی ہے:

ہدایہ، جلد۲، صفحہ۲۴۸

”و أما إذا تزوجها ليحلها للأول فكره تحريماً لأن فيه استعمال المرأة وسيلة له فى مباح بلا شبهة، و لو دخل بها ثم فارقها حلت للأول“۔

فتاوی ہندیہ (عالمگیری)، جلد۱، صفحہ۳۴۲

”وإن تزوجها ليحلها لزوجها الأول، يكره تحريماً إذا اشترطا أن يطلقها بعد الدخول لتكون له حلالا، لأن فيه استعمال المرأة وسيلة للمباح“۔

بدائع الصنائع، جلد۲، صفحہ۲۴۵

”والنكاح إذا كان قصده التوصل إلى إحلال المرأة للزوج الأول، كره تحريماً لأن ذلک منكر“۔

یہ عبارتیں ثابت کرتی ہیں کہ حلالہ کی نیت سے نکاح کرنا مکروہ تحریمی ہے، لیکن اگر شرائط پوری ہوجائیں جیسے کہ دخول اور طلاق، تو عورت پہلے شوہر کے لیے حلال ہوجاتی ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

رضاعی بھائی کی بہن سے نکاح کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں جو فقہاء فرماتے ہیں:

”یجوز أن یتزوج الرجل باخت اخیه من الرضاع کما یجوز أن یتزوج باخت اخیه من النسب“۔ اس عبارت کا مطلب کیا ہے؟ تفصیل کے ساتھ فقہ حنفی کی مستند اور معتبر کتابوں کے حوالے کے ساتھ بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہاء کے بیان کے مطابق مذکورہ عبارت کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اپنے رضاعی بھائی کی بہن سے اس طرح نکاح کرسکتا ہے جس طرح نسبی بھائی کی بہن سے نکاح کرسکتا ہے، بشرطیکہ ان کے درمیان کوئی شرعی مانع نہ ہو۔ یعنی اگر ایک عورت کسی مرد کے رضاعی بھائی کی بہن ہو (جس کا مطلب ہے کہ وہ عورت اس مرد کی ماں کا دودھ پی کر اس کی رضاعی بہن بن گئی ہو)، تو اس سے نکاح کرنا جائز ہے، بشرطیکہ ان کے درمیان کوئی اور حرمت کی وجہ نہ ہو۔

فقہ حنفی کے معتبر اور مستند کتب سے اس مسئلے کے حوالے درج ذیل ہیں:

۱- بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، جلد نمبر۲، صفحہ نمبر:۲۷۶

”ویجوز أن یتزوج الرجل بأخت أخیه من الرضاع، لأن الأخوة من الرضاع لاتثبت من الرضاع“۔

۲- مجمع الأنهر فی شرح ملتقی الأبحر، جلد نمبر۱، صفحہ نمبر۴۲۱

”ویجوز له أن يتزوج أخت أخيه من الرضاع كما يجوز له أن يتزوج أخت أخيه من النسب“۔

۳-البحر الرائق شرح کنز الدقائق، جلد نمبر ۳، صفحہ نمبر ۹۰

”ولا فرق بين أن تكون أختا له من الرضاع أو من النسب في جواز التزوج بها“۔

یہ کتب حنفی فقہ کے معتبر مآخذ ہیں اور ان میں مذکورہ مسئلہ کی وضاحت کی گئی ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

مرتد کا نکاح کسی بھی عورت سے نہیں ہوسکتا اس کی حکمت

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص مرتد ہوگیا تو حضرات فقہا فرماتے ہیں کہ ایسا شخص نہ کسی مسلمان عورت سے شادی کرسکتا ہے نہ کافر عورت سے نہ مرتد عورت سے تو اس کی علت اور حکمت کیا ہے؟ فقہ حنفی کی مستند و معتبر کتابوں کے حوالے کے ساتھ بتلائیں۔

جواب: الجواب حامدا ومصلیا

فقہ حنفی کے مطابق، مرتد (جو اسلام سے پھر جائے) کے نکاح کے بارے میں حکم ہے کہ مرتد کا نکاح فوراً فسخ ہوجاتا ہے اور اسے دوبارہ کسی بھی عورت، خواہ وہ

مسلمان ہو یا غیر مسلم یا مرتدہ ہو سے نکاح کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس حکم کی علت اور حکمت فقہاء نے یوں بیان کی ہے کہ مرتد اپنے ایمان سے منحرف ہو کر اسلام کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے، اور اسلام کی بنیادوں پر مبنی نکاح کا رشتہ اس پر لاگو نہیں رہتا۔

مستند و معتبر کتابوں کی عبارات:

۱- الدر المختار مع رد المحتار:

"ویفسخ النکاح بالردة قبل الدخول بالإجماع وبعده فی أظهر الروایتین"۔

مرتد ہونے سے نکاح فوراً فسخ ہو جاتا ہے، اور اس میں اجماع ہے، دخول سے پہلے ہو یا بعد میں، دونوں صورتوں میں نکاح فسخ ہو جائے گا (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الطلاق باب المرتد)۔

۲- فتاوی عالمگیریہ:

"المرتد إذا کان له زوجة مسلمة أو ذمیة أو مرتدة انفسخ النکاح فی الحال، ولا تحل له مطلقا، لأن المرتد لا نکاح له".

اگر مرتد کے پاس مسلمان، ذمیہ (غیر مسلم) یا مرتدہ بیوی ہو تو نکاح فوراً فسخ ہو جاتا ہے، اور وہ اس کے لیے مطلقاً حلال نہیں ہوتی، کیونکہ مرتد کے لیے نکاح نہیں ہوتا (الفتاوی الہندیہ کتاب النکاح، باب المرتد)۔

علت اور حکمت :

۱-اسلام سے خروج:

مرتد ہونے کا مطلب اسلام سے خروج ہے، جس کے بعد اس کے تمام اسلامی حقوق وفرائض منقطع ہو جاتے ہیں، جن میں نکاح کا رشتہ بھی شامل ہے، یہ حکم اس لیے ہے تاکہ اسلام کی پاکیزگی اور اس کی بنیادی عقائد کو محفوظ رکھا جا سکے۔

۲-ایمان کی حفاظت:

اسلامی شریعت کا مقصد ایمان کی حفاظت ہے، اور مرتد کا نکاح برقرار رکھنا یا اسے نئے نکاح کی اجازت دینا اس اصول کے خلاف ہے۔ اس لیے مرتد کو نکاح کی اجازت نہیں دی جاتی تاکہ اسلام کی حدود و قیود کی حفاظت ہو۔

یہ حکم فقہ حنفی کی بنیاد پر ہے اور اسلامی قانون میں مرتد کے حقوق وفرائض کو واضح کرتا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

زوجین میں سے کسی ایک کے مسلمان ہونے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں، مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں میاں بیوی میں سے

ایک نے اسلام قبول کرلیا لیکن شوہر نے اسلام قبول نہیں کیا تو اس صورت میں شرعی حکم کیا ہے؟ فقہ حنفی کی معتبر کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامدا ومصلیا

فقہ حنفی کے مطابق اگر میاں یا بیوی میں سے ایک نے اسلام قبول کرلیا اور دوسرا اسلام پر نہیں آیا، تو اس صورت میں ان کے نکاح کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے۔

۱-اگر شوہر اسلام قبول کرے:

اگر شوہر اسلام قبول کرلیتا ہے، تو نکاح برقرار رہتا ہے اور دونوں کا رشتہ قائم رہتا ہے۔

۲-اگر بیوی اسلام قبول کرے:

اگر بیوی اسلام قبول کرتی ہے اور شوہر غیر مسلم ہی رہتا ہے، تو نکاح فوراً فسخ نہیں ہوتا، بلکہ ایک عدت کا وقت دیا جاتا ہے تاکہ اگر شوہر اسلام قبول کرلے تو نکاح برقرار رہے۔ عدت کی مدت گزر جانے کے بعد بھی اگر شوہر اسلام قبول نہیں کرتا تو نکاح خود بخود فسخ ہو جائے گا۔

مستند و معتبر کتابوں کی عبارات:

۱-الدر المختار مع رد المحتار:

”إِذَا أَسْلَمَتْ الْمَرْأَةُ وَ زَوْجُهَا كَافِرٌ فإن كان قبل المس وقع

الفراق لعدم الوَطْءِ، وَإِنَّ كَانَ بَعْدَهُ فَإِنْ لَمْ يسلم بَعْدَ انْقِضَاءِ الْعِدَّةِ وَقَعَ الْفَرَاقُ"۔

جب عورت اسلام قبول کر لے اور اس کا شوہر کافر ہو، اگر یہ قبولیت اسلام مباشرت سے پہلے ہوئی تو فوراً فراق آ جاتا ہے، اور اگر مباشرت کے بعد ہوئی تو شوہر کو عدت کی مدت تک اسلام قبول کرنے کا وقت دیا جاتا ہے۔ اگر عدت گزرنے کے بعد بھی شوہر اسلام قبول نہیں کرتا تو نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الطلاق، باب المرتد)۔

۲-فتاوی عالمگیری:

"و إذا أسلمت الزوجة قبل الدخول انفسخ النكاح على الفور، وإن كان بَعْدَ الدُّخُولِ تمُسكها عِدة النساء، فإن أسلم فى هذه المدة فهما على نكاجهما، وإلا انفسخ النكاح.

اگر زوجہ دخول سے پہلے اسلام قبول کرے تو فوراً نکاح فسخ ہو جاتا ہے، اور اگر دخول کے بعد اسلام قبول کرے تو عدت کے دوران زوجین کا نکاح برقرار رہتا ہے۔ اگر اس دوران شوہر اسلام قبول کر لے تو نکاح برقرار رہتا ہے، ورنہ نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ (الفتاوی الہندیہ، کتاب النکاح، باب المرتد)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

چار سے زیادہ عورتوں سے نکاح کی ممانعت کی حکمت

سوال: اگر کوئی شخص چار سے زیادہ عورتوں کے درمیان عدل کرسکتا ہواور اس کی مالی حیثیت بھی چار سے زیادہ ہو چار سے زیادہ بیویوں کے اخراجات سہولت کے ساتھ ادا کرسکتا ہواور تعلیم وتربیت کے لیے بھی اس کے پاس بہت افراد ہوں جو اس کا بھی نظم کرسکتا ہو تو کیا اس صورت میں شریعت چار سے زیادہ بیک وقت نکاح کی اجازت دے گی؟ اگر نہیں تو کیوں؟

جواب: الجواب حامدا ومصلیاً

اسلامی شریعت میں ایک مرد کے لیے بیک وقت چار عورتوں سے زیادہ نکاح کی اجازت نہیں ہے، خواہ وہ عدل وانصاف برقرار رکھنے، مالی اخراجات پورا کرنے، یا بچوں کی تعلیم وتربیت کا مناسب انتظام کرنے کے قابل ہو۔ یہ حکم قرآن مجید کی واضح آیت سے ثابت ہے اور اس میں کوئی استثنا نہیں ہے۔

قرآن مجید کی وضاحت:

اللہ تعالی نے قرآن مجید میں فرمایا:

"فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنی وثلاث و رُبَاعَ فإن خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوا فواحدة" (سورۃ النساء: ۴:۳)۔

ترجمہ: پس تمہیں جو عورتیں پسند آئیں، ان میں سے دو، تین یا چار سے نکاح کرو، اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کرسکو گے تو ایک ہی کافی ہے۔

شرعی حدود اور حکمت:

اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابندی:

اسلامی شریعت کے مطابق، مرد کے لیے بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی ممانعت قطعی ہے۔ یہ حکم اللہ تعالی کا ہے اور اس میں عدل، انصاف، مالی حیثیت یا دیگر عوامل کی بنا پر کوئی استثنا نہیں ہے۔

عدل کا پیمانہ:

شریعت میں عدل کا مفہوم وسیع ہے، اور یہ صرف مالی اخراجات پورا کرنے یا جسمانی ضروریات پوری کرنے تک محدود نہیں ہے۔ عدل میں دل کی محبت اور تعلق بھی شامل ہے، جو کہ انسانی قدرت سے باہر ہے۔

خاندانی نظام کی حکمت:

چار بیویوں کی حد شریعت نے خاندانی نظم و ضبط، بچوں کی تربیت، اور معاشرتی استحکام کو مدنظر رکھتے ہوئے مقرر کی ہے، زیادہ بیویوں کے باعث خاندانی نظام میں پیچیدگی اور کشیدگی پیدا ہوسکتی ہے۔

فقہاء کی آراء:

بدائع الصنائع للعلامہ کاسانی:

”و إنـما وضع هذا العدد لأنه قدر لا تبلغ فيه المشقة إلى مبلغ لا يحتمل“ (جلد۲، صفحہ ۱۸۷)۔

ترجمہ: یہ تعداد (چار بیویوں کی) اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ اس حد تک مشقت نہیں پہنچتی جو برداشت نہ کی جا سکے۔

فتاوی عالمگیریہ:

”ولا يجوز زيادة النساء على أربع لقوله تعالى: ”فانكحوا ماطاب لكم من النساء“ إلى قوله ”فواحدة“ إلى ”اربع“ (جلد۱، صفحہ ۲۹۶)۔

ترجمہ: چار بیویوں سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق، پس تمہیں جو عورتیں پسند آئیں، ان میں سے دو، تین یا چار سے نکاح کرو، اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی کافی ہے۔

خلاصہ:

اسلامی شریعت میں چار بیویوں کی حد قطعی اور حتمی ہے، اور اس میں کسی بھی حال میں استثنا نہیں ہے، چاہے کسی کی مالی حیثیت کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو، یا وہ عدل وانصاف برقرار رکھنے کی کتنی ہی صلاحیت کیوں نہ رکھتا ہو۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

صرف چار عورتوں سے شادی کا فلسفہ

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان دین اور علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ قرآن اور حدیث میں ایک مرد کے لیے صرف چار عورتوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنے کی اجازت ہے اس سے زیادہ نہیں، اس کی علت اور حکمت اور اس کا فلسفہ کیا ہے؟ مستند و معتبر کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامدا ومصليا

اسلام میں ایک مرد کے لیے بیک وقت چار عورتوں سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس حکم کی حکمت اور علت کو قرآن و حدیث کی روشنی میں اور فقہاء و علماء کی تشریحات کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید کی روشنی میں:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

"فانكحوا ما طاب لكم من النساء مثنٰى وثُلاثَ ورُباعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً" (سورۃ النساء ۴:۳)۔

ترجمہ: پس تمہیں جو عورتیں پسند آئیں، ان میں سے دو، تین یا چار سے نکاح کرو، اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی کافی ہے۔

حکمت اور علت :

عدل وانصاف کی اہمیت:

اسلام میں عدل وانصاف کی بنیاد پر خاندان کی تشکیل کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ چار بیویوں تک کی اجازت عدل وانصاف کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اس سے زیادہ بیویوں کے ساتھ عدل کرنا دشوار ہے، لہٰذا تعداد کو محدود کر دیا گیا۔

خاندانی نظم وضبط:

ایک محدود تعداد میں بیویوں کے ساتھ نکاح کرنے سے خاندانی نظام میں نظم وضبط برقرار رہتا ہے، اور بچوں کی تربیت اور پرورش میں آسانی ہوتی ہے۔

مالی ذمہ داری:

چار بیویوں کی مالی کفالت اور ان کے حقوق کی ادائیگی کے لیے ضروری وسائل ہونا بھی ایک اہم شرط ہے۔ اس سے زیادہ نکاح کرنے پر مالی بوجھ اور حقوق کی عدم ادائیگی کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

فقہاء کی آراء:

بدائع الصنائع للعلامۃ کلسانی:

”وإنـما وضع هذا العدد لأنه قدر لا تبلغ فيه المشقة إلى مبلغ

لا يحتمل" (جلد۲،صفحہ۱۸۷)۔

ترجمہ: یہ تعداد چار بیویوں کی اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ اس حد تک مشقت نہیں پہنچتی جو برداشت نہ کی جا سکے۔

فتاوی عالمگیریہ:

"ولا يجوز زيادة النساء على أربع لقوله تعالى: "فانكحوا ماطاب لكم من النساء) إلى قوله (فَوَاحِدَة) إلى "اربع" (جلد۱،صفحہ۲۹۶)۔

ترجمہ: چار بیویوں سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق، پس تمہیں جو عورتیں پسند آئیں، ان میں سے دو، تین یا چار سے نکاح کرو، اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی کافی ہے۔

خلاصہ:

اسلامی شریعت میں ایک مرد کے لیے بیک وقت چار عورتوں سے زیادہ نکاح کی اجازت نہ دینا ایک منصفانہ، متوازن اور عملی حکم ہے، جو عدل وانصاف، خاندانی نظم وضبط اور مالی ذمہ داری کو مدنظر رکھتا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

دوسری شادی کے لئے پہلی بیوی سے اجازت کا حکم

ســـوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیان کرام اس مسئلے میں کہ ایک شخص نے

ایک عورت سے شادی کی لیکن اس کو دوسری عورت سے شادی کی ضرورت محسوس ہوئی تو کیا دوسرا نکاح کرنے کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری ہے یا نہیں؟ فقہ حنفی کی مستند و معتبر کتابوں کے حوالے سے اس کا جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً ومصليا

فقہ حنفی کے مطابق، ایک شخص کے لیے دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا شرعاً ضروری نہیں ہے۔ شریعت نے اس بات کو لازم نہیں کیا کہ پہلی بیوی سے اجازت لی جائے، لیکن اخلاقی اور معاشرتی طور پر پہلی بیوی کو آگاہ کرنا بہتر سمجھا جاتا ہے تاکہ خاندانی نظم وضبط برقرار رہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتب سے حوالہ جات:

بدائع الصنائع للعلامہ کاسانی:

"ولا تجب مشاورة المرأة في تزويج ثانية" (جلد۲، صفحہ۳۲۰)۔

ترجمہ: دوسری شادی کے لیے عورت کی مشاورت ضروری نہیں ہے۔

فتاوی عالمگیریہ:

"وليس عليه أن يستاذن زَوْجَتَهُ فِي النكاح مِنْ نِسَاءِ آخر" (جلد۱، صفحہ۲۹۲)۔

ترجمہ: شوہر پر دوسری شادی کے لیے اپنی بیوی سے اجازت لینا واجب نہیں ہے۔

فتح القدیر لابن الہمام:

"لا شيء عليه إذا تزوج مِنْ نِسَاءِ أُخَرَ مِنْ غَيْرِ إِذْنِ الْمَرْأَةِ"

(جلد۳،صفحہ۱۱۰)۔

ترجمہ: اگر شوہر دوسری عورتوں سے شادی کرتا ہے تو اسے اپنی بیوی کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

خلاصہ:

فقہ حنفی کے مطابق، شوہر کے لیے دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا شرعاً ضروری نہیں ہے۔ تاہم، یہ بہتر ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو آگاہ کرے تاکہ خاندانی تعلقات میں دراڑ نہ آئے اور خاندانی نظم برقرار رہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

تجدید نکاح اور مہر کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اور علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر مسلمان کو مہینہ دو مہینہ یا سال میں کم از کم ایک مرتبہ تجدید نکاح کر لینا چاہیے، اب سوال یہ ہے کہ یہ بات کس کی ہے؟ اور کیا اس کی حیثیت شرعی اعتبار سے واجب ہے یا سنت ہے یا مستحب؟ جب

تجدید نکاح کیا جائے گا تو اس وقت مہر نیا مقرر کرنا ہوگا؟ اور اس مہر کی ادائیگی بھی ضروری ہوگی؟ اس مسئلے پر تفصیل کے ساتھ فقہ حنفی کی مستند اور معتبر کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامدا ومصلیا

اسلامی شریعت میں تجدید نکاح کرنے کی کوئی شرعی بنیاد نہیں ہے، ہر مسلمان کو مہینے، دو مہینے یا سال میں کم از کم ایک مرتبہ تجدید نکاح کرنے کا عمل نہ تو واجب ہے، نہ سنت ہے، اور نہ ہی مستحب ہے۔ یہ خیال کسی خاص اسلامی فقیہ یا مکتبہ فکر سے متعلق نہیں ہے اور اس کا کوئی شرعی جواز نہیں ہے۔

تجدید نکاح کی ضرورت:

شریعت میں نکاح کے بعد اس کی تجدید کی کوئی شرعی ضرورت نہیں ہے۔ نکاح ایک بار صحیح طور پر ہو جانے کے بعد اس کی تجدید کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

فقہ حنفی کی معتبر کتب میں تجدید نکاح:

بدائع الصنائع للعلامۃ کاسانی:

”و إذا تم النكاح لا يشترط أن يُجدد لأنَّهُ لَمْ يُوجَدُ دَلِيلٌ عَلَى تجديد النكاح“ (جلد۲، صفحہ۲۹۷)۔

ترجمہ: جب نکاح مکمل ہو جائے، تو اس کی تجدید کی کوئی شرط نہیں ہے کیونکہ تجدید نکاح پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

فتاوی عالمگیریہ:

”التجدید لایعتبر فی النکاح وإنما النکاح کامل وصحیح“

(جلد ۱، صفحہ ۳۰۸)۔

ترجمہ: نکاح میں تجدید کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اور نکاح مکمل اور صحیح ہے۔

فتح القدیر لابن الہمام:

”النکاح یکون صحیحًا و فاسداً وإذا کان صحیحا فلایشترط تجدیدہ“ (جلد ۳، صفحہ ۱۱۵)۔

ترجمہ: نکاح صحیح اور فاسد ہوتا ہے۔ اگر نکاح صحیح ہے تو اس کی تجدید کی ضرورت نہیں ہے۔

مہر اور اس کی ادائیگی:

اگر تجدید نکاح کا عمل غیر ضروری سمجھا جائے، تو اس صورت میں نئے مہر کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تاہم اگر کوئی شخص نکاح کی تجدید کرتا ہے، تو اس کے لیے نیا مہر مقرر کرنا پڑے گا اور اس کی ادائیگی بھی ضروری ہوگی۔

خلاصہ:

اسلامی شریعت میں ہر مسلمان کے لیے تجدید نکاح کرنا نہ تو واجب ہے، نہ سنت، اور نہ ہی مستحب نکاح کی تجدید کی کوئی شرعی ضرورت نہیں ہے اور اگر تجدید نکاح

کی جائے تو اس وقت مہر نیا مقرر کرنا اور اس کی ادائیگی کرنا ضروری ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

متعینہ لڑکی کے بجائے دوسری لڑکی کے نام پر نکاح کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے ایک عورت سے شادی کی لیکن نکاح کے وقت نکاح پڑھانے والے نے جس عورت سے شادی طے تھی اس کے بجائے اس کی بہن کا نام لے کر شوہر سے قبول کروالیا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ نکاح صحیح ہوا یا نہیں؟ اور اس صورت میں کیا کرنا ہوگا؟

جواب: الحواب حامداً ومصليا

فقہ حنفی کے مطابق اگر نکاح کے وقت نکاح پڑھانے والے نے کسی اور عورت کا نام لے کر نکاح کرایا، تو یہ نکاح صحیح نہیں ہے۔ نکاح کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ نکاح میں شریک تمام افراد کا نام درست ہو اور وہ صحیح طور پر پہچانے جائیں۔

فقہ حنفی کی معتبر کتب سے حوالہ جات:

بدائع الصنائع للعلامۃ کاسانی:

"فإذا نكح الناكح على غير المعينة فإن النكاح لا يُفيد" (جلد۲، صفحہ۱۳۵)۔

ترجمہ: اگر نکاح کرنے والا ایسی عورت سے نکاح کرے جس کا نام صحیح طور پر متعین نہ ہو، تو نکاح درست نہیں ہوگا۔

فتاوی عالمگیریہ:

"وإذا تم النكاح على غير المعينة فإن النكاح لا يصح" (جلد۱، صفحہ۲۹۰)۔

ترجمہ: اگر نکاح ایسی عورت سے کیا جائے جو صحیح طور پر متعین نہ ہو تو نکاح درست نہیں ہوگا۔

فتح القدیر لابن الہمام:

"وإذا تزوج على نية النكاح من إمرأة فإذا كانت النساء مختلفات وقع النكاح على مَنْ أُصِيبَ مِنْهُنَّ" (جلد۳، صفحہ۱۰۱)۔

ترجمہ: اگر نکاح ایک عورت کے لیے نیت کر کے کیا جائے اور اس وقت غلط نام لیا جائے، تو نکاح اسی عورت پر ہوگا جس کا نام لیا گیا۔

نکاح کی تصحیح:

چونکہ نکاح صحیح نہیں ہوا، تو اس صورت میں نکاح کو دوبارہ صحیح طریقے سے کرنا ضروری ہے۔ اس میں فریقین کو صحیح طریقے سے پہچان کر نئے سرے سے نکاح کیا جائے۔

جدید نکاح:

اور نئے نکاح کے ذریعے فریقین کی صحیح پہچان اور رضامندی کی بنیاد پر نکاح کرنا ضروری ہے۔

خلاصہ:

نکاح کے وقت اگر نام درست نہ ہو تو نکاح صحیح نہیں ہوتا، اس صورت میں نکاح کو درست کرنے کے لیے نئے سرے سے صحیح طریقے سے نکاح کرنا ضروری ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

مطلقہ بائنہ کی عدت میں اس کی بہن سے شادی کا حکم

سوال: ایک شخص نے ایک عورت سے شادی کی اس کے بعد اس کو طلاق بائن دے دیا، مطلقہ ابھی عدت کے اندر تھی اس نے مطلقہ کی بہن سے شادی کر لیا، یہ درست ہے یا نہیں؟

جواب: الجواب حامدا ومصليا

فقہ حنفی کے مطابق ایک مرد اپنی بیوی کو طلاق بائن دے دینے کے بعد عدت کے دوران اس کی بہن سے نکاح نہیں کر سکتا، شریعت میں عدت کے دوران کسی اور عورت سے نکاح ممنوع ہے، اور خصوصاً مطلقہ کی بہن کے ساتھ نکاح کرنا تو خاص طور پر منع ہے، کیونکہ یہ "جمع بين الأختين" یعنی دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنے کے مترادف ہے، جو کہ شریعت میں حرام ہے۔

الدر المختار میں اس مسئلے کی وضاحت موجود ہے؟

”ولا تحل أختها لما في الزاهدية عن أبي يوسف أنها أجنبية في الظاهر لا تحل له أختها في عدتها“ (ردالمحتار علی الدر المختار، ج۳،ص۱۷)۔

ترجمہ: اور عدت کے دوران (مطلقہ کی) بہن حلال نہیں ہوتی کیونکہ امام ابو یوسف سے زاہدیہ میں منقول ہے کہ وہ (مطلقہ) ظاہری طور پر اجنبیہ ہو جاتی ہے، لیکن اس کی بہن اس کی عدت کے دوران اس مرد کے لیے حلال نہیں ہوتی۔

بدائع الصنائع میں بھی یہی مسئلہ بیان ہوا ہے:

”فإذا طلق امرأته بائنا فلا يجوز أن يتزوج أختها حتى تنقضي عدتها“ (بدائع الصنائع، ج۲،ص۲۷۳)

ترجمہ: پس جب ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق بائن دے دے تو ان کی بہن سے اس وقت تک نکاح جائز نہیں ہے جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔

لہٰذا عدت کے دوران مطلقہ کی بہن سے نکاح کرنا شریعت کے اصولوں کے خلاف ہے اور حرام ہے۔ جب تک مطلقہ کی عدت پوری نہ ہو جائے، اس کی بہن سے نکاح جائز نہیں ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

زانی پر مزنیہ کی ماں اور بیٹی کے حرام ہونے کی وجہ

سوال: اگر کسی شخص نے کسی عورت سے زنا کرلیا تو زانی کے اوپر اس کی ماں اور اس

کی لڑکی حرام ہو جاتی ہے، اس کی علت کیا ہے، مستند و معتبر کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامدا ومصليا

فقہ حنفی میں زنا کرنے کی صورت میں زانی پر زانیہ کی ماں اور اس کی بیٹی حرام ہو جاتی ہے۔ حکم کی علت "شہوت کا سبب بننا" ہے، یعنی زنا ایک فعل ہے جو شہوت کے تحت انجام پاتا ہے۔ اور اس شہوت کے سبب زانی پر زانیہ کی محارم (ماں اور بیٹی) سے نکاح حرام ہو جاتا ہے۔ یہ حکم احتیاط کے پیش نظر دیا گیا ہے تا کہ محرمات کے دائرے میں شامل افراد کی عزت و ناموس کی حفاظت ہو سکے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب "الدر المختار" میں اس مسئلے کی وضاحت موجود ہے:

"وَيَحرم على الزاني التزوج بأصول الزانية وفروعها على المعتمد، وهو قول أبي حنيفة ومحمد" (ردالمحتار علی الدر المختار، ج:۳، ص:۲۸)۔

ترجمہ: اور زانی پر زانیہ کی اصول (ماں اور اوپر کی نسل) اور فروع (بیٹی اور نیچے کی نسل) سے نکاح حرام ہو جاتا ہے، یہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد کا قول ہے۔

بدائع الصنائع میں بھی یہ مسئلہ مذکور ہے:

"فَإِنَّهُ بِالزِّنَا صَارَ مِنهَا عَلَى الْمَعْنَى الَّذِي يُحرمه" (بدائع الصنائع، ج:۲، ص:۲۶۷)۔

ترجمہ: بیشک زنا کے ذریعے زانی کے لیے زانیہ سے ایسی حیثیت پیدا ہو جاتی ہے جو اس پر حرمت کا سبب بنتی ہے۔

یہ احکام شرعی احتیاط کے اصول کے تحت نافذ ہوتے ہیں تاکہ خاندانوں کے درمیان عزت واحترام اور پاکدامنی برقرار رہ سکے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

تین طلاق کے بعد حلالہ کے بجائے دونوں مرتد ہو گئے اور اسلام قبول کر کے دوبارہ نکاح کر لیا

سوال: ایک عورت سے شادی کی، شادی کے بعد دونوں اچھی طرح زندگی گزار رہے تھے، کسی وجہ سے ایک مرتبہ اپنی بیوی کو تین طلاق دے دیا، اب اس کے بعد حلالہ کا نمبر آیا تو بجائے حلالہ کے دونوں مرتد ہو گئے، اب مرتد ہونے کے بعد دوبارہ نکاح پڑھا لیا، تو فقہ حنفی کے اعتبار سے اس کا کیا حکم ہے، حوالہ کے ساتھ بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً ومصلیا

فقہ حنفی کے مطابق اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو تین طلاق دے دے تو یہ طلاقیں مؤثر ہو جاتی ہیں اور عورت اس مرد پر حرمت مغلظہ کے ساتھ حرام ہو جاتی ہے، یعنی وہ عورت اب اس مرد کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہو سکتی جب تک وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کر لے اور پھر وہ مرد (دوسرا شوہر) اسے اپنی مرضی سے طلاق نہ دے یا

اس کا انتقال نہ ہو جائے۔ اس عمل کو ''حلالہ'' کہتے ہیں۔

اگر دونوں میاں بیوی مرتد ہو جائیں اور پھر دوبارہ اسلام قبول کر لیں، تو ارتداد کے بعد نکاح خود بخود ختم ہو جاتا ہے اور دوبارہ اسلام قبول کرنے پر نیا نکاح ضروری ہوتا ہے۔ تاہم، تین طلاقوں کا حکم بدستور برقرار رہتا ہے۔ یعنی وہ عورت تین طلاقوں کے بعد، بغیر حلالہ کے پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہو سکتی، چاہے ارتداد کے بعد نکاح دوبارہ کیا جائے۔

فتاوی ہندیہ میں اس حوالے سے ذکر ہے:

''فإذا ارتد الرجل أو المرأة، وقعت الفرقة بينهما بحكم ارتدادهما، وإذا اسْلَمَا فَلَا بُدَّ مِنْ تَجْدِيدِ النكاح لكن الطلاق الثلاث باقٍ وَيَحْرُمُ الوطء حتى تنكح زوجا غيرة'' (الفتاوی الہندیۃ، ج۱،ص ۳۵۳)۔

ترجمہ: اگر مرد یا عورت مرتد ہو جائیں تو ارتداد کے حکم سے ان کے درمیان تفریق واقع ہو جاتی ہے، اور جب وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں تو نکاح کی تجدید کرنا ضروری ہوتا ہے، لیکن تین طلاقیں باقی رہتی ہیں اور وطی حرام ہوتی ہے جب تک کہ وہ عورت دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے۔

اسی طرح الدر المختار میں ذکر ہے:

''وَإِذَا ارْتَدَّ الْمُسْلِمَانِ زَوْجَانِ تَفَرَّقا بنفس الارتداد، وإذا أسلما فلا بد من تَجْدِيدِ النِّكَاحَ وَإِذَا كَانَ الطلاق بَيْنَهُمَا قَبْلَ الارتداد طلاق ثلاث بقي وحرم عليه'' (ردالمحتار علی الدر المختار، ج۳،ص ۲۵۲)۔

ترجمہ: اگر میاں بیوی مرتد ہو جائیں تو ارتداد کے سبب ان کے درمیان تفریق ہو جاتی ہے، اور جب وہ اسلام قبول کرتے ہیں تو نکاح کی تجدید ضروری ہوتی ہے، اور اگر ارتداد سے پہلے تین طلاق ہو چکی ہوں تو وہ باقی رہتی ہیں اور عورت پہلے شوہر پر حرام ہوتی ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

زوجین میں سے ایک کے مرتد ہونے کا حکم

سوال: یہ ہے کہ اگر میاں بیوی میں سے کوئی ایک مرتد ہو جائے تو ان کا نکاح ختم ہو جائے گا یا علیحدگی کے لیے طلاق دینی پڑے گی؟

جواب: الجواب حامداً ومصلیا

فقہ حنفی کی مستند کتابوں کی روشنی میں، اگر میاں بیوی میں سے کوئی ایک مرتد ہو جائے تو ان کا نکاح خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں طلاق دینے کی ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ نکاح کا تعلق دین اسلام کے ساتھ ہے اور مرتد ہونے کی صورت میں نکاح ختم ہو جاتا ہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں اس مسئلے کی وضاحت یوں ہے:

۱- کتاب الخانیۃ:

"وَإِذَا رَدَّ أَحَدُهُمَا جاز للطريق وصار النكاح فاسدا" (کتاب الخانیہ، ج:۲،ص:۱۱٦)۔

۲-الدر المختار:

"إذا ارتد أحد الزوجين فالنكاح فاسد ويجب الطلاق" (الدر المختار، ج:۲،ص:۱۵۱)۔

۳-الفتاوی الہندیۃ:

"إذا ارتد أحد الزوجين يفسد النكاح" (الفتاوی الہندیۃ، ج:۱،ص:۲۱۴)۔

یہ اقتباسات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ارتداد کی صورت میں نکاح کا تعلق ختم ہو جاتا ہے اور طلاق کی ضرورت نہیں ہوتی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

آقا باندی سے نکاح کیوں نہیں کرسکتا؟

سوال: فقہاء نے لکھا ہے کہ آقا کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنی باندی سے وہ نکاح کرے، اس کی وجہ کیا ہے علت کیا ہے؟ فقہ حنفی کی کتابوں کی روشنی میں بتلائیں۔

جواب: الجواب حامدا ومصليا

فقہ حنفی کے مطابق، آقا کے لیے اپنی باندی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ باندی پر اس کا حق ملکیت ہے، اور شریعت میں مالک اور مملوک کے درمیان

نکاح کا کوئی تصور نہیں ہے۔ باندی آقا کے لیے ایسی حیثیت رکھتی ہے جہاں وہ اس کے ساتھ بغیر نکاح کے مباشرت کرسکتا ہے، اور یہ اسلامی فقہ میں نکاح کی شرطوں کے منافی ہے۔ نکاح ایک قانونی معاہدہ ہے جو دو آزاد افراد کے درمیان ہوتا ہے، جبکہ باندی کی حیثیت مملوکہ کی ہے۔

الدرالمختار میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے:

"ولا يصح نكاح مملوكته لأنها تحت يده يستحلها بملك اليمين، فلا يصح النكاح عليها" (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج:۳،ص۴۲)۔

ترجمہ: اپنی مملوکہ سے نکاح درست نہیں ہے، کیونکہ وہ اس کی ملکیت میں ہے اور وہ اس سے بغیر نکاح کے حلال ہوجاتی ہے، لہٰذا نکاح اس سے درست نہیں ہے۔

بدائع الصنائع میں بھی یہی مسئلہ بیان کیا گیا ہے:

"وفي المملوكة لا يصح النكاح على المملوكة لأنها تحت يده بملك اليمين، فصارت بمنزلة الزوجة " (بدائع الصنائع، ج:۲،ص:۲۶۸)۔

ترجمہ: مملوکہ سے نکاح صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ اس کی ملکیت میں ہے اور اس کی حیثیت بیوی کے مانند ہوجاتی ہے۔

اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں نکاح کی بنیاد حقوق اور واجبات پر ہوتی ہے جبکہ ملکیت میں باندی کے ساتھ براہ راست جنسی تعلقات جائز ہیں اور نکاح کے لیے ملکیت اور حقوق کا تعلق ایک دوسرے سے متضاد ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

بغیر استبرائے رحم کے حضور ﷺ کا حضرت صفیہ سے نکاح کا حکم

سوال: (۱) سلطان المحدثین حضرت اقدس مفتی حبیب اللہ صاحب مدظلہ العالی کی خدمت میں ایک سوال ہے وہ یہ کہ حدیث بخاری شریف کی ہے: **فلما نظر الیھا النبی ﷺ قال خذ جاریۃ من السبی غیرھا قال فاعتقھا النبی صلی علیہ وسلم وتزوجھا"** (الحدیث، صفحہ نمبر ۵۴، جلد اول)۔

معلوم یہ کرنا ہے کہ بغیر استبراء رحم کے شادی کرنا حضور صلی علیہ وسلم کے خصائص میں ہے یا اور کچھ وجہ؟

آپ نے شب عروس بھی منایا اور ولیمہ بھی صفیہ بنت حیی کیا۔

جواب: آپ کے سوال کا مکمل مدلل جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ حدیث کا جو حوالہ آپ نے دیا ہے، وہ صحیح بخاری کی حدیث ہے جس میں حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا کے بارے میں ذکر ہے۔

حدیث کا متن:

حدیث میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا کو دیکھا تو فرمایا:

"خذ جاریۃ من السبی غیرھا قال فاعتقھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم وتزوجھا"۔

مسئلہ استبراءرحم:

عام طور پر جب جنگ میں قیدی عورتیں مسلمان ہو جائیں تو ان کے رحم کی پاکی کا یقین حاصل کرنے کے لیے استبراء کیا جاتا ہے، یعنی ان کے لیے حیض کا ایک دورانیہ گزرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ ان کے حمل کا شک نہ رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص:

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بغیر استبراءرحم کے نکاح کرنا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے تھا؟ اس سلسلے میں علماء نے مختلف آراء پیش کی ہیں:

۱-خاصہ نبوی:

کچھ علماء کا خیال ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے تھا کہ آپ بغیر استبراءرحم کے نکاح کر سکتے تھے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی تھی اور آپ کی ہر بات اور ہر عمل الہامی اور معصوم ہوتا تھا۔

امام نووی اپنی شرح صحیح مسلم میں لکھتے ہیں:

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استبراءرحم کی شرط نہیں تھی۔ (شرح نووی علی مسلم جلد ۱۰، صفحہ: ۴۱)۔

۲-استبراء کی ضرورت نہ ہونا

کچھ علماء کا کہنا ہے کہ حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا کے بارے میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے یقین ہو گیا تھا کہ وہ پاک ہیں اور ان کے رحم میں کوئی شک نہیں ہے، اس لیے استبراء کی ضرورت نہیں تھی۔

علامہ ابن حجر عسقلانی اپنی کتاب فتح الباری میں لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے یقین دلایا گیا تھا کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے رحم میں کوئی حمل نہیں ہے، اس لیے استبراء کی ضرورت نہیں تھی۔

(فتح الباری، جلد ۷، صفحہ ۴۶۲)۔

شب عروس اور ولیمہ:

حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب عروس بھی منائی اور ولیمہ بھی کیا۔

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا، اور ولیمہ کیا جس میں ستو اور کھجور پیش کیے گئے۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر ۴۲۱۳)۔

نتیجہ:

لہٰذا، یہ واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا سے استبراء رحم کے بغیر نکاح کرنا ان کے خصائص میں سے تھا اور اللہ تعالی کی طرف سے وحی کے ذریعے یقین دلایا گیا تھا کہ وہ پاک ہیں۔ اس لیے استبراء کی شرط

کی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

فضولی کا مجلس نکاح میں ہونے کا حکم

سوال: زید کا نکاح کوئی فضولی کرے اور جس مجلس میں فضولی نکاح کا ایجاب وقبول کرائے اگر اس مجلس میں زید بھی موجود ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فضولی اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسرے آدمی کے لئے ایسا تصرف کرے جس تصرف کی نہ تو شریعت کی طرف سے اس کو ولایت حاصل ہو اور نہ تو اس کو اپنا وکیل بنایا ہو اور بوقت عقد دولہا وہاں موجود نہ ہو بلکہ فضولی ہی اپنے طور پر زید کا نکاح کردے بعد میں زید فعلاً اس کی اجازت دے دے، یعنی کسی کے ذریعہ نکاح میں طے شدہ مہر ادا کردے اور اس کے بعد تعلق ازدواجیت قائم کرلے۔

الفضولی هو من یتصرف لغیره بغیر ولایة ولا وکالة (بحرالرائق، ج:۳،ص:۱۴۷)۔**قوله، بالفعل کبعث المهر او بعضه بشرط ان یصل إلیها و قیل الوصول** (وہکذا فی محمود الفتاوی، ج:۴،ص:۴۱۰)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

مطلقہ حاملہ کا ایک ماہ کے بعد بچہ ساقط کروا کر دوسرے سے نکاح کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ زید نے ہندہ سے شادی کی کچھ دنوں کے بعد ہندہ کو حمل ٹھہرا اس حمل کو ابھی ایک ماہ ہوئے تھے کہ زید نے دواء وغیرہ کے ذریعہ حمل کو ساقط کروادیا یا ہندہ نے خود ساقط کروادیا، اسقاط حمل کے بعد ابھی ایک حیض گزرا تھا کہ ہندہ نے کسی دوسرے شخص سے نکاح کرلیا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں ایک حیض کے گزرنے کے بعد ہندہ کسی اجنبی شخص سے نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً ومصلیاً

صورت مسئولہ میں ہندہ کی عدت جو طلاق مغلظہ کے بعد لازم ہوئی تھی ایک ماہ کے حمل کو ساقط کرنے کے بعد پوری نہیں ہوئی، چونکہ اس حمل کے اعضاء ابھی ظاہر نہیں ہوئے تھے بلکہ تین حیض کے ذریعہ اس کی عدت پوری ہوگی۔ لہٰذا ایک حیض گزرنے کے بعد جو نکاح ہوا وہ نکاح تکمیل عدت سے پہلے ہوا ہے جو معتبر نہیں ہے، اگر ہندہ نے عدت کے اندر کسی سے نکاح کرلیا تو وہ نکاح فاسد وباطل ہے۔

قال فی البحر: و إذا أسقطت سقطاً استبان بعض خلقه انقضت به العدة، لانه ولد و ان لم یستبن بعض خلقه لم تنقض، لان

الحمل اسم نطفة متغيرة بدليل ان الساقط إذا كان علقة او مضغة لم تنقض به العدة، لانها لم تتغير فلا يعرف كونها متغيرة بيقين إلا باستبانة بعض الخلق، كذا في المحيط (البحر الرائق، کتاب الطلاق باب العدة کوئٹہ ۴/۱۳۵، زکریا: ۴/۲۲۹، شامی، کراچی: ۳/۵۱۱، زکریا: ۵/۱۹۰، الموسوعۃ الفقہیۃ ۲۹/۳۱۹)۔

اما نكاح منكوحة الغير و معتدته فالدخول فيه لايوجب العدة إن علم انها للغير لانه لم يقل احد بجوازه فلم ينعقد اصلاً (شامی کتاب النکاح، مطلب: فی النکاح الفاسد، کراچی ۳/۱۳۲، زکریا ۴/۲۷۴)۔

لايجوز لرجل إن يتزوج زوجة غيره و كذلك المعتدة (ہندیہ، زکریا قدیم ۱/۲۸۰، جدید ۱/۳۴۶)، (وہکذا فی فتاوی قاسمیہ ۱۷/۴۸۲-۴۹۰)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

کلما کی قسم کھانے والے کا نکاح فضولی نے کرایا لیکن دس ہاتھ کے فاصلہ پر قسم کھانے والا بیٹھا ہوا تھا؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ زید جس نے کلما کی قسم کھا رکھی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنا نکاح جو وہ کرنے سے قاصر ہے اس لئے ایک شخص نے فضولی بن کر اس کا نکاح ایک عورت

سے کرایا، لیکن جس مکان میں فضولی نے اس کا ایجاب وقبول کرایا اس مکان میں دس ہاتھ کے فاصلے پر زید بیٹھا ہوا تھا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کے دس ہاتھ کے فاصلے پر اسی مکان میں بیٹھنے کی وجہ سے مجلس عقد میں کیا زید کی شرکت تصور کی جائے گیا یا نہیں؟ چونکہ فضولی کے نکاح کے صحیح ہونے کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اصل مجلس عقد میں نہ ہو۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

صورت مسئولہ میں عبارات فقہاء کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زید کے صرف مکان نکاح میں موجود ہونے کی وجہ سے مجلس عقد میں موجودگی نہیں سمجھی جائے گی، چونکہ مجلس کے لغوی معنی موضع جلوس کے ہیں، لہٰذا جس جگہ عاقدین اور شہود بیٹھے ہوئے ہیں وہی جگہ مجلس میں داخل ہوگی، لہٰذا اگر زید اس جگہ موجود ہو جہاں فضولی اور گواہ بیٹھے ہوئے ہیں تب تو زید کی موجودگی مجلس عقد میں سمجھی جائے گی اور اس سے فضولی کا عمل متاثر ہوگا۔ لیکن صورت مسئولہ میں چونکہ زید دس ہاتھ کے فاصلے پر بیٹھا ہوا ہے تو اگرچہ مکان ایک ہے لیکن مجلس ایک نہیں ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں فضولی کا عمل متاثر نہیں ہوگا۔

مجلس العقد مركب اضافي من لفظين هما: مجلس و العقد. والمجلس في اللغة: هو موضع الجلوس و أماالعقد في اللغة فهو: نقيض الحل و في الاصطلاح: العقد هو ربط اجزاء التصرف بالايجاب والقبول، و مجلس العقد في الاصطلاح هو الاجتماع

للعقد جاء فی مجلة الاحکام العدلیة مجلس البیع هو الاجتماع الواقع بعقد البیع (الموسوعة الفقهیة:۳۶/۱۴۴)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

نکاح پر اجرت لینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ اگر دلہن باکرہ ہو تو اس کا نکاح پڑھانے کا ہدیہ ایک دینار ہے اور اگر ثیبہ ہو تو آدھا دینار ہے، کیا یہ بات صحیح ہے؟ کیونکہ بعضے حضرات فتاوی ہندیہ، (ج:۳،ص:۳۴۵) کا حوالہ اس کے لئے دیتے ہیں **والمختار للفتوی انه إذا عقد بکرا یاخذ دیناراً و فی الثیب نصف دینار ویحل له ذلک هکذا قالوا کذا فی البرجندی**۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ بات درست اور صحیح ہے؟

جواب: الجواب و بالله التوفیق:

نکاح خوانی کی اجرت آپسی رضامندی سے جو مقدار بھی چاہیں متعین کر سکتے ہیں اور اس کا لینا شرعاً جائز ہے، لیکن شریعت مقدسہ میں اس کی کوئی مقدار متعین نہیں اور ہندیہ کی جو عبارت پیش کی گئی ہے وہ بھی درست ہے، اگر اس پر بھی عمل کیا جائے تو جائز و مباح ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں (مستفاد کفایت المفتی قدیم، ج:۵، ص: ۱۵۱، امداد الفتاوی، ج:۳، ص:۲/۳۷۲، فتاوی قاسمیہ، ج:۱۲، ص:۶۹۸)۔

و كل نكاح باشره القاضي و قد وجبت مباشرته عليه كنكاح الصغار و الصغائر فلا يحل له اخذ الاجرة عليه و مالم تجب مباشرتهٗ عليه حل له اخذ الأجرة عليه كذا في المحيط واختلفوا في تقديره والمختار للفتوى انه إذا عقد بكرا الخ (ہندیہ، ج:۳،ص:۳۴۵، الباب الخامس عشر فی اقال القاضی مکتبہ رشیدیہ، پاکستان)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

جہیز اور زیورات وغیرہ کی ملکیت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

(۱) شادی میں جو سامان دولہے کو دیا جاتا ہے جیسے گھڑی،، انگوٹھی، چین اور گاڑی وغیرہ، کیا واپس کرنا ہے؟ اس پر کس کا حق ہے؟

(۲) جو زیور دولہے کی طرف سے لڑکی کو دیا گیا ہے اس پر کس کا حق ہے؟

(۳) جو جہیز کا سامان لڑکی لے کر آئی ہے مثلاً فریج، صوفہ، کرسی، میز وغیرہ اس پر کس کا حق ہے؟

(۴) اور جو زیور لڑکی کی ماں نے لڑکی کو دیا ہے اس پر کس کا حق ہے۔

جواب: الجواب و باللہ التوفیق

(۱) شادی کے موقع پر جو سامان بغیر کسی دباؤ اور بلا مطالبہ دولہا کو دیا جاتا ہے

مثلاً: گھڑی، انگوٹھی، چین وغیرہ اس کا مالک دولہا ہے، یہ شرعاً ہبہ ہے اور ہبہ کرنے سے جس کے لئے ہبہ کیا جائے وہ مالک ہوجاتا ہے، اس سے واپس لینا درست نہیں اور اگر وہ سامان دباؤ یا مطالبہ کی وجہ سے دیا گیا ہے تو اس کا لین دین جائز نہیں کیونکہ یہ ظلم ہے۔

الهبة عقد مشروع لقوله عليه السلام "تهادوا تحابوا" و على ذلك انعقد الاجماع و تصح بالايجاب و القبول و القبض (ہدایہ ۲۸۳/۳، کتاب الھبۃ)۔

(۲) شادی کے موقع پر جو زیور دولہا کی طرف سے لڑکی کو یعنی دولہن کو دیا گیا ہے اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر دولہا نے وہ زیور دولہن کو ملکیت کے طور پر دیا ہے تو دولہن زیور کی مالکہ ہوگی اور اگر عاریت کے طور پر دیا ہے تو دولہا زیور کا مالک ہوگا، اور اگر ملکیت و عاریت کسی کی تصریح نہیں کی ہے تو برادری، علاقہ و عرف کو دیکھا جائے گا کہ اس علاقہ میں کس طور پر دیا جاتا ہے، اگر ملکیت کے طور پر ہو تو عورت مالکہ ہوگی اور اگر عاریت کے طور پر ہو تو لڑکا مالک ہوگا، آپ دیکھ لیں آپ کے علاقہ میں کیا دستور ہے (مستفاد کتاب النوازل ۴۴۷/۸، فتاوی قاسمیہ ۶۵۳/۱۲، فتاوی دار العلوم دیوبند ۳۶۰/۸)۔

جهز ابنته ثم ادعى ان ما دفعه لها عارية و قالت هو تمليك فالمعتمد ان القول للزوج و لها إذا كان العرف مستمرا إن الاب يدفع مثله جهازا لا عارية (الدر المختار باب المہر)۔

و المعتمد البناء على العرف كما علمت (شامی زکریا ۳۰۹/۴)۔

جزء ۳، ۴: جو جہیز کا سامان لڑکی میکے سے لے کر آئی ہے اسی طرح لڑکی کی ماں نے لڑکی کو جو زیورات دیئے ہیں ان سب سامانوں اور زیورات کی مالکہ لڑکی ہے، کیونکہ یہی عرف ہے۔

جهز ابنته بجهاز و سلمها ذلك ليس له الاسترداد منها ولورثته بعده إن سلمها ذلك في صحته بل تختص به و به يفتي (درمختار مع الشامی زکریا، کتاب النکاح ۴/۳۰۶، ۳۰۷)۔

المعتمد البناء على العرف (شامی، زکریا،۴/۳۰۱)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

شوہر کا بیوی کو ماں باپ سے ملنے سے روکنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ زید کا نکاح ایک عورت سے ہوا جس کو کافی عرصہ گزر چکا ہے، اور اس کے کئی بچے بھی ہیں لیکن وہ اپنی بیوی کو کئی سال سے اپنے ماں باپ سے ملنے کی اجازت نہیں دیتا ہے اور نہ ہی فون پر بات کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

بیٹی ماں باپ سے ملنے کتنے دنوں میں جاسکتی ہے؟

(۱) اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بیٹی اپنے ماں باپ سے ملنے کے لئے کتنے دنوں میں جاسکتی ہے؟

اگر کوئی شوہر بیٹی کو ماں باپ سے نہ ملنے دے تو اس کا حکم

(۲) اگر کوئی خبیث شوہر ماں باپ سے ملنے کے لئے نہ بھیجے اور نہ جانے

دے نہ فون پر بات کرنے دے تو ایسے خبیث شوہر کی کیا سزا ہے؟

اگر بیوی ماں باپ سے بات کرلے تو شوہر کے لئے سننا جائز ہے؟

(۳) اگر بیوی اپنے ماں باپ اور بہنوں سے فون سے بات کرے تو شوہر کے لئے اس بات کو سننا جائز ہے یا نہیں؟

اگر شوہر بیوی کے ماں باپ کو برا بھلا کہے اس کا کیا حکم ہے؟

(۴) اگر شوہر بیوی کو بلاوجہ ٹارچر کرے یا اس کو ذہنی اذیت پہونچائے یا اس کے سامنے ماں باپ کو گالی دے یا برا بھلا کہے تو اس بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً

(۱) دین اسلام نے ہر ایک کے حقوق و فرائض کو مقرر کردیا ہے جیسے زوجین کے حقوق، والدین کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، مسافروں کے حقوق وغیرہ اب ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کو بھی ادا کرے، کسی کی حق تلفی، ایذا رسانی کا ذریعہ نہ بنے، اس مختصر تمہید کے بعد عرض ہے کہ شوہر کا رویہ قطعاً غلط اور شریعت اسلامیہ کے خلاف ہے، بیٹی کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ ہفتہ میں ایک دن والدین کی زیارت و ملاقات کے لئے جاسکتی ہے اسی طرح والدین کو ہفتہ میں ایک دن اپنی بیٹی کی ملاقات و زیارت کی شرعی اجازت ہے اگر قریب ہوں۔

الصحیح المفتی به من انها تخرج للوالدین فی کل جمعة باذنه و بدونه (شامی صفحہ نمبر ۳۲۹/۵، المکتبہ الاشرفیہ دیوبند)۔

و قیل لایمنعها من الخروج الی الوالدین ولا یمنعهما من الدخول علیها فی کل جمعة و فی غیرهما من المحارم التقدیر بسنة وهو الصحیح (ہدایہ صفحہ نمبر ۴۲۱/۲، باب النفقہ)۔

(۲) جوشوہر اپنی بیوی کو والدین سے ملاقات کے لئے نہ جانے دے، فون سے بات نہ کرنے دے وہ بڑا گنہگار اور فاسق ہے، کیونکہ وہ رشتہ کو توڑنے والا ہے اور قطع رحمی ناجائز ہے، حدیث شریف میں وارد ہے "**لایدخل الجنة قاطع**" رشتہ توڑنے والا جنت میں نہیں جائے گا (متفق علیہ، مشکوۃ، صفحہ نمبر ۴۱۹/۲)۔

(۳) اگر بیوی اپنے والدین یا بہنوں سے بات کرتی ہے اور بیوی کو یہ پسند نہیں کہ اس کا شوہر اس بات کو سنے تو شوہر کو ایسی باتوں کے سننے سے احتراز کرنا ضروری ہے، اگر بیوی کو کوئی ناراضگی نہ ہو تو شوہر اپنی بیوی کی باتوں کو سن سکتا ہے، لیکن شوہر کے لئے اپنی بیوی کی باتوں کو خفیہ طور پر سننا جس کو تجسس کہتے ہیں ناجائز ہے، ارشاد باری ہے "**ولاتجسسوا**" (سورہ حجرات، آیت نمبر ۱۲)۔

(۴) شوہر کا یہ عمل شرعاً ناجائز ہے کیونکہ یہ ایذاء مسلم ہے جو حرام ہے۔

حدیث شریف میں ارشاد نبوی ہے: "**المسلم من سلم المسلمون من لسانه و یده**" (مشکوۃ صفحہ نمبر ۱۵/۱)۔

دوسری حدیث ہے: "**سباب المسلم فسوق و قتاله کفر**" (متفق علیہ، مشکوۃ صفحہ نمبر ۴۱۱/۲)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

معتدہ سے نکاح کا حکم

سوال: معتدہ سے نکاح کا حکم کیا ہے؟ مدلل جواب چاہیے۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

معتدہ سے نکاح کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، چاہے وہ عدت طلاق کی ہو یا عدت وفات کی، کیونکہ عدت کے دوران عورت سے نکاح ممنوع ہے اور اس کے نکاح کا عقد باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَالْـمُـطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَن يَـكْتُـمْـنَ مَـا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِن كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ“ (سورۃ البقرہ:228)۔

ترجمہ: اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں اور ان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے رحم میں جو کچھ ہوا سے چھپائیں، اگر وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”لَا يُنْكِحُ الْمُحِلُّ وَلَا يُنْكِحُ فِي الْعِدَّةِ“ (سنن الترمذی:1121)۔

ترجمہ: نہ حلالہ کرنے والا نکاح کرے اور نہ عدت والی عورت سے نکاح کیا جائے۔

لہٰذا، معتدہ سے نکاح کا اقدام شرعی احکام کی کھلی خلاف ورزی ہے اور اس کا کوئی

اعتبار نہیں ہوگا۔اس میں دونوں فریقین گناہ گار ہوں گے اوراس نکاح کا کوئی وجو نہیں۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

سوتیلی سالی کے بیٹے کے نکاح کا حکم

الجواب حامداً و مصلیاً

آپ کے سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ زید نے اپنی پہلی بیوی کلثوم سے شادی کی، جن سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔کلثوم کا انتقال ہوگیا، پھر زید نے دوسری شادی زینب سے کی، اور زینب کی ایک بہن کریمہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا زید کی سوتیلی سالی (زینب کی بہن) کریمہ کا نکاح زید کے پہلے بیٹے سے ہوسکتا ہے یا نہیں؟

شریعت کے اصول کے مطابق زید کی سوتیلی سالی (زینب کی بہن) کریمہ، زید کے پہلے بیٹے کے لیے نامحرم ہے، اوران دونوں کا نکاح جائز ہے۔شریعت میں سسرالی رشتے میں صرف زید کی بیوی (پہلی یا دوسری) کے ساتھ محرمیت پیدا ہوتی ہے، بیوی کی بہن یا دیگر رشتہ داروں کے ساتھ نہیں، لہٰذا زید کے بیٹے اور کریمہ کے نکاح میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے۔

فقہ کی کتابوں میں اس کی مثالیں موجود ہیں:

ا- درمختار میں ہے:

”ومن المحرمات بالمصاهرة الزوجة وأمهاتها، وبنات

الـزوجة، وزوجة الأب وزوجة الابـن وغيـر ذٰلک لايحرّم" (جلد2،صفحہ 446،مطبوعہ دار الفکر)۔

۲-فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"لايـحـرّم إلا الـزوجة وأمهـا وبـنت الزوجة و زوجة الاب و زوجة الابن" (جلد1،صفحہ 283،مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ)۔

یہ دونوں حوالے اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ سوتیلی سالی کے ساتھ بیٹے کا نکاح جائز ہے۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

تلک لینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے میں کہ ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں بالخصوص بہار میں یہ رواج ہے کہ جب کوئی لڑکی والا لڑکے والے کے پاس اپنی بچی کا رشتہ لے کر جاتا ہے تو وہ تلک کے نام پر موٹی رقم کا مطالبہ اس سے کرتا ہے، اور وصول کرتا ہے کبھی چار چکا گاڑی مانگتا ہے کبھی موٹر سائیکل مانگتا ہے اب دریا طلب امر یہ ہے کہ اس طرح سے لڑکے والوں کا لڑکی والوں سے 10 لاکھ 20 لاکھ روپیہ تلک کے نام پر لینا یا گاڑی لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

تلک کی رسم جو ہندوستان کے مختلف علاقوں خصوصاً بہار میں رائج ہے، جس میں لڑکی والوں سے موٹی رقم یا دیگر مادی اشیاء جیسے گاڑی وغیرہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے، اسلامی شریعت میں جائز نہیں ہے۔ اس قسم کا مطالبہ شرعی لحاظ سے ناجائز ہے اور اس میں کئی مفاسد شامل ہیں۔

پہلا: یہ رسم دراصل لڑکی والوں پر ظلم اور ان کے مالی بوجھ میں اضافے کا باعث بنتی ہے ،جس کا شریعت میں کوئی جواز نہیں ہے۔ شریعتِ مطہرہ میں شادی کے معاملات کو آسان بنانے کی تاکید کی گئی ہے، جبکہ یہ رسم ان معاملات کو مشکل بناتی ہے۔

دوسرا: یہ عمل دراصل ایک قسم کی رشوت کے زمرے میں آتا ہے، کیونکہ بغیر کسی شرعی عوض کے مال لینا رشوت کی طرح ہے، اور حدیث میں رشوت لینے اور دینے والے دونوں پر لعنت کی گئی ہے:

”لعن الله الراشی و المرتشی“ (سنن ابی داود، کتاب الاقضیۃ، باب فی الرشوۃ، حدیث نمبر:3580)۔

تیسرا: اسلامی شریعت میں نکاح کو سادگی سے ادا کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”أَعْظَمُ النِّكَاحِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُ مَؤُونَةً“۔

یعنی وہ نکاح سب سے زیادہ برکت والا ہے جس میں خرچ کم ہو (مسند احمد، حدیث نمبر:24595)۔ لہٰذا تلک کی بھاری رقم یا قیمتی اشیاء کا مطالبہ اس حدیث کے خلاف ہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں بھی اس قسم کی رسومات کی ممانعت موجود ہے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

"وأما ما يؤخذ من المرأة أو من أوليائها لغير مهر ونفقة فذلك لا يجوز (ردالمحتار، جلد 4، صفحہ 87)۔

ترجمہ: "عورت یا اس کے اولیاء سے مہر اور نفقہ کے علاوہ کوئی اور چیز لینا جائز نہیں ہے"۔

اس عبارت سے واضح ہے کہ شریعت میں مہر کے علاوہ لڑکی والوں سے کوئی اور چیز لینا جائز نہیں ہے، اور یہ تلک کی رقم یا گاڑی کا مطالبہ قطعاً ناجائز ہے۔

لہٰذا، "نتیجہ" یہ ہے کہ تلک کے نام پر لڑکی والوں سے رقم یا قیمتی اشیاء کا مطالبہ شرعاً ناجائز، غیر اسلامی اور شریعت کے مقاصد کے خلاف ہے۔ ایسے معاملات میں سادگی اور اخلاص کو ترجیح دینی چاہیے، تاکہ نکاح آسان ہو اور اس میں برکت پیدا ہو۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

شوہر کے کون سے حقوق بیوی کے ذمہ ہیں؟

سوال: سوال یہ ہے کہ شوہر کے وہ کون کون سے حقوق ہیں جو بیوی کے ذمہ واجب ہیں؟ ان کی تفصیلات فقہ حنفی کی مستند و معتبر کتابوں کے حوالے سے ترتیب

کے ساتھ تفصیل کے ساتھ بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصليا

بیوی پر شوہر کے واجب حقوق کو فقہ حنفی کی مستند کتب کے حوالوں کے ساتھ درج ذیل ترتیب میں پیش کیا جاتا ہے:

ا-اطاعتِ شوہر:

شوہر کی جائز امور میں اطاعت بیوی پر واجب ہے۔ یہ اطاعت گھر کی سربراہی اور امورِ خانہ داری میں شامل ہے۔

الدر المختار میں ہے:

"وللزوج عليها أن يحفظ ما يأمرها به في غير معصية" (الدر المختار، کتاب النکاح، ج3، ص186)۔

۲-زوجیت کے حقوق کی ادائیگی:

بیوی پر شوہر کے حق زوجیت کی ادائیگی واجب ہے، بشرطیکہ شوہر نے مہر ادا کیا ہو اور بیوی کو اپنی مرضی کے مطابق رہائش دی ہو۔

ردالمحتار میں ہے:

"اذا سلمت نفسها على المهر المستحق وجب عليها أن تمكنه من نفسها" (ردالمحتار، ج3، ص187)۔

۳-گھر کے کام کاج:

فقہ حنفی کے مطابق بیوی پر یہ واجب نہیں کہ وہ گھر کے کام کاج کرے، لیکن اگر وہ اس کی ذمہ داری قبول کرتی ہے تو اس میں شوہر کی اطاعت ضروری ہوگی۔

بدائع الصنائع میں ہے:

"لیس علیها أن تخدم الزوج ولیس للزوج إلزامها بالخدمة"

(بدائع الصنائع، ج2، ص331)۔

۴-شوہر کے گھر میں قیام:

بیوی پر واجب ہے کہ وہ شوہر کے ساتھ اس کے گھر میں رہے، بغیر کسی جائز عذر کے گھر چھوڑنا جائز نہیں ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"لها السکنی مع الزوج ما لم یکن معذورا فی ترک السکنی" (فتاویٰ عالمگیری، ج1، ص545)۔

۵-شوہر کی عزت اور مال کی حفاظت:

بیوی پر یہ واجب ہے کہ وہ شوہر کی عزت و ناموس کی حفاظت کرے اور اس کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر خرچ نہ کرے۔

الدرالمختار میں ہے:

"وللزوج عليها حفظ ماله وصيانته عن الأجانب" (الدرالمختار، ج3، ص186)۔

٦-شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہ جانا:

بیوی پر لازم ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہ نکلے، سوائے ضروری حالات کے۔

ردالمحتار میں ہے:

"ليس لها أن تخرج من بيت الزوج بغير إذنه" (ردالمحتار، ج3، ص189)۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿باب الاولیاء والاکفاء﴾

کیا صنعت وحرفت بھی کفاءت میں داخل ہے؟

سوال: کفاءت میں کن کن چیزوں کا اعتبار ہے؟ کیا صنعت وحرفت بھی کفاءت میں داخل ہے؟ اس میں تفصیل کے ساتھ فقہ حنفی کی کتابوں کے حوالے سے جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً ومصلیا

فقہ حنفی میں کفاءت کا اصول نکاح کے معاملے میں اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ زوجین کے درمیان کچھ مخصوص امور میں برابری یا مطابقت ہونی چاہیے، کفاءت کی شرط کے تحت درج ذیل امور کو اہم سمجھا جاتا ہے۔

۱- **دین وتقوی:** دونوں فریقین کا دیندار اور متقی ہونا۔

۲- **نسب:** خاندان یا قبیلے کی مساوات۔

۳- **مال ودولت:** مالی حیثیت اور کفالت کی صلاحیت۔

۴- **حرفت وپیشہ:** پیشے کی نوعیت اور سوشل اسٹیس۔

۵- **آزادی:** آزاد یا غلام ہونے کا مسئلہ۔

فقہ حنفی کی معتبر کتب سے حوالہ جات:

۱-بدائع الصنائع للعلامۃ کاسانی:

”واعلم أن الکفائة تعتبر فی ستة أشیاء فی النسب والإسلامِ وَالْحُرِیَّةِ وَالدِّینِ والصنعة وَالْمَالِ“ (جلد۲،صفحہ۳۲۴)۔

ترجمہ: کفاءت چھ چیزوں میں معتبر ہے: نسب، اسلام، آزادی، دین، پیشہ اور مال۔

۲-فتاوی عالمگیریہ:

”ویُعتبر فِی الْکِفَائةِ النَّسبُ والدِّیْنُ وَالْحِرْفَةُ وَالْمَالُ وَالْحَریة“(جلد۱،صفحہ۲۹۶)۔

ترجمہ: کفاءت میں نسب، دین، پیشہ، مال اور آزادی کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

۳-فتح القدیر لابن الہمام:

”الکفائة عِنْدَنَا تُعْتَبَرُ فِی خَمْسَةِ أشْیَاءَ النَّسَب وَالدِّین وَالْمَالِ وَالْحِرْفَةِ وَالْحُرِیَةِ“ (جلد۳،صفحہ۱۲۵)۔

ترجمہ: ہمارے نزدیک کفاءت پانچ چیزوں میں معتبر ہے: نسب، دین، مال، پیشہ، اور آزادی۔

صنعت وحرفت:

پیشہ یا صنعت وحرفت بھی کفاءت کا ایک اہم جزو ہے، کیونکہ یہ سماجی مقام

اور حیثیت کا تعین کرتی ہے۔فقہاء نے اس کی اہمیت پر زور دیا ہے تا کہ معاشرتی سطح پر مناسبت اور یکسانیت برقرار رہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

ولی اقرب وابعد اور غیبت منقطعہ کا تعارف

سوال: یہ ہے کہ فقہا یہ لکھتے ہیں اگر ولی اقرب کی غیبت منقطعہ ہو تو بچی کا نکاح ولی ابعد کرسکتا ہے،سوال یہ ہے کہ ولی اقرب کس کو کہتے ہیں؟ اور ولی ابعد کس کو کہتے ہیں؟ اور غیبت منقطعہ سے کیا مراد ہے؟ فقہ حنفی کی معتبر اور مستند کتابوں کے حوالے سے اس کا جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامدا ومصليا

ولی اقرب:

فقہ حنفی کے مطابق ولی اقرب وہ ہوتا ہے جو نسبی تعلق کے اعتبار سے عورت کے سب سے قریب ہو، جیسے والد، دادا، بھائی وغیرہ۔

ولی ابعد:

ولی ابعد وہ ہوتا ہے جو ولی اقرب کے بعد دوسرے درجے کا ولی ہو، جیسے چچا، وغیرہ۔

غیبت منقطعہ:

غیبت منقطعہ سے مراد وہ غیبت ہے جس میں ولی اقرب اس طرح سے غیر حاضر ہو کہ اس سے نکاح کی اجازت حاصل کرنا ممکن نہ ہو، جیسے ولی اقرب کا اتنے دور سفر پر جانا کہ وہاں سے اجازت لینا مشکل ہو، یا اس کا لاپتہ ہونا۔

حوالہ جات:

۱- بدائع الصنائع للعلامۃ کاسانی:

اس میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اگر ولی اقرب غیر حاضر ہو تو ولی ابعد کو نکاح کا حق حاصل ہو جاتا ہے، بشرطیکہ غیبت منقطعہ ہو۔

۲- فتاوی عالمگیریہ:

اس کتاب میں بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ولی اقرب کی غیبت منقطعہ کی صورت میں ولی ابعد کو نکاح کا اختیار دیا گیا ہے۔

۳- فتاوی دار العلوم دیوبند:

اس میں بھی اس مسئلے کی تفصیل موجود ہے کہ کس صورت میں ولی اقرب کی غیبت منقطعہ تصور کی جائے گی اور ولی ابعد کو نکاح کا حق حاصل ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

دس سال کے بچہ کا نکاح اگر ولی کرا دے تو ایجاب وقبول کون کرے گا؟

سوال: اگر دس سال کے بچے کا اس کے ولی نے نکاح پڑھا دیا تو فقہائے حنفیہ کہتے ہیں وہ نکاح صحیح ہے، اب سوال یہ ہے کہ ایجاب وقبول دس سال کا بچہ کرے گا یا اس کا ولی؟ اس کی طرف سے وکیل ہو کر کے قبول کرے گا؟ فقہ حنفی کی مستند و معتبر کتاب کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً ومصلیا

فقہ حنفی میں نابالغ (بچہ یا بچی) کا نکاح ولی کی اجازت اور اختیار کے تحت جائز ہے، نابالغ کی طرف سے ایجاب وقبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اس لیے اس کے ولی (عام طور پر والد یا دادا) کو اس کے نکاح کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے، ولی نابالغ کی جانب سے نکاح کا ایجاب وقبول کرتا ہے، اور اس صورت میں ولی خود یا کسی وکیل کے ذریعے یہ ذمہ داری انجام دے سکتا ہے۔

فقہ حنفی کی مستند کتاب ''الدر المختار'' میں اس مسئلے کی وضاحت کی گئی ہے:

''یصح نکاح الصبی والصبیة من أولیائهما بلا خیار لهما عند أبی حنیفة ومحمد'' (رد المحتار علی الدر المختار، ج:۲، ص:۵۲۸)۔

ترجمہ: امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک نابالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح ان کے اولیاء (والد یا دادا وغیرہ) کے ذریعے بغیر اختیار کے صحیح ہے۔

بدائع الصنائع میں بھی یہی مسئلہ بیان کیا گیا ہے:

”ولا يصح نكاح الصبي والصبية إلا بإذن وليهما وعقده“

(بدائع الصنائع، ج۲،ص۲۳۹)۔

ترجمہ: نابالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح ان کے ولی کی اجازت اور عقد کے بغیر صحیح نہیں ہوتا۔

اس لیے دس سال کے بچے کا نکاح ولی کی طرف سے ہوتا ہے اور ایجاب وقبول ولی ہی کرتا ہے یا ولی کے مقرر کردہ وکیل کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

لڑکے کے بالغ ہونے کے بعد باپ کی ولایت کا حکم

سوال: لڑکا جب بالغ ہو جائے تو باپ کی حیثیت اس کے لئے ولی کی باقی رہتی ہے یا نہیں؟ اور باپ کو ولایت کا درجہ حاصل رہتا ہے یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

لغوی اعتبار سے ولی کے معنی مالک کے ہیں اور شرعی اعتبار سے وارث مکلّف کو ولی کہا جاتا ہے۔

ولی، ولایت سے ماخوذ ہے اور ولایت کے معنی تنفیذ الامر علی الغیر ہے، یعنی دوسرے پر حکم کو مامور کرنا، پھر ولایت کی دو قسمیں ہیں:

(۱)ولایت ندب (۲)ولایت اجبار

ولایت اجبار جیسے صغیرہ اور معتوقہ پر باپ کو حاصل ہوتی ہے اور ولایت ندب جیسے عاقلہ بالغہ پر باپ کو حاصل ہوتی ہے اور اس کے ثبوت کے چند اسباب ہیں: (۱) قرابت (۲) ملک (۳) ولاء (۴) امامت۔

حضرات فقہاء کی تصریحات سے پتہ لگتا ہے کہ بالغ لڑکے پر بھی باپ کی ولایت باقی رہتی ہے، اگر چہ وہ ولایت اجبار نہ سہی ولایت ندب ہی کیوں نہ ہو، بلکہ عرف عام میں تو ولایت اجبار بھی باپ کو حاصل ہوتی ہے، اسی لئے اگر باپ کسی کام سے منع کر دے تو عرف عام میں اس کام کا کرنا اولاد کے لئے ممنوع سمجھا جاتا ہے۔

الولی لغةً المالک، و شرعاً الوارث المکلف کما فی المحیط وغیره (سکب الانہر، ج:۱،ص:۳۳۷)۔

الولی من الولایة وهی تنفیذ الامر علی الغیر (مجمع الانہر، ج:۱،ص:۳۳۲)۔

الولی هو العاقل البالغ الوارث والولایة علی نوعین ولایةندب علی العاقلة البالغة و ولایة اجبار علی الصغیرة والمعتوقة والموقوفة وتثبت بقرابة وملک و ولاء و امامة کما سیتضح (سکب الانہر، ج:۱،ص:۳۳۲)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿باب المهر﴾

نکاح کے بعد مہر میں کمی زیادتی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں ایک شخص کا نکاح ایک عورت سے پچاس ہزار پر طے پایا لیکن نکاح کے بعد شوہر نے اپنی طرف سے مہر میں اضافہ کردیا ایک لاکھ روپیہ کردیا، یا بیوی نے اپنی مہر پچاس ہزار کے بجائے پچیس ہزار کردیا تو کیا شرعاً درست ہے۔

جواب: الجواب حامداً ومصليا

فقہ حنفی کے مطابق مہر ایک عقد (عقد نکاح) کا اہم حصہ ہے، اور اس میں اضافہ یا کمی کرنا بعداز نکاح جائز ہے، بشرطیکہ فریقین کی رضامندی ہو۔

مہر میں اضافہ:

اگر شوہر نکاح کے بعد اپنی مرضی سے مہر میں اضافہ کرنا چاہے، تو یہ جائز ہے، اور یہ اضافہ بیوی کے حق میں واجب الاداہوگا۔

مہر میں کمی:

اگر بیوی اپنی مرضی سے مہر میں کمی کرنا چاہے تو یہ بھی جائز ہے، بشرطیکہ یہ کمی اس کی رضا سے ہو اور اس پر کسی قسم کا دباؤ نہ ہو۔

فقہ حنفی کی معتبر کتب سے حوالہ جات:

۱-بدائع الصنائع للعلامة کاسانی

"فإذا زادها فی الصداق فی النکاح فالزیادة تصیر مهرًا بإیجابه" (جلد۲، صفحہ۲۸۹)۔

ترجمہ: اگر شوہر نکاح کے دوران مہر میں اضافہ کرے تو یہ اضافہ اس کے لیے واجب الادا ہو جائے گا۔

۲-فتاویٰ عالمگیریہ:

"لا بأس بالزیادة والنقصان فی المهر بعد العقد مع رضاهما" (جلد۱، صفحہ۳۵۰)۔

ترجمہ: عقد کے بعد مہر میں اضافہ یا کمی کرنا دونوں فریق کی رضامندی سے جائز ہے۔

۳-فتح القدیر لابن الہمام:

"وإذا زادها فی الصداق أو أسقطته المرأة بعد النکاح جاز" (جلد۳، صفحہ۹۸)۔

ترجمہ: اگر شوہر مہر میں اضافہ کرے یا بیوی اس میں کمی کرے، تو یہ بعد از نکاح جائز ہے۔

خلاصہ:

شرعی نقطہ نظر سے، نکاح کے بعد شوہر کی طرف سے مہر میں اضافہ کرنا یا بیوی کی طرف سے مہر میں کمی کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ کام رضامندی سے ہو۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

تعلیم قرآنی کو مہر بنانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اور علماء دین اس مسئلے کے بارے میں ایک عالم نے جاہل عورت سے اس شرط پر نکاح کیا کہ میں تم کو قرآن پڑھنا سکھا دوں گا۔ گویا کہ اس نے تعلیم قرآن ہی کو مہر بنا دیا اور مال مہر میں ذکر نہیں کیا، تو کیا اس صورت میں تعلیم قرآن کافی ہے مہر کے عوض میں یا اس کو مہر دینا پڑے گا، یعنی مال دینا ہوگا؟ اگر مال دینا ہوگا تو کتنا دینا ہوگا؟ فقہ حنفی کی مستند و معتبر کتابوں کے حوالے کے ساتھ بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً ومصلیا

فقہ حنفی کے مطابق مہر کے طور پر مال کا ذکر ضروری ہے، کیونکہ مہر عورت کا

شرعی حق ہے۔ تعلیم قرآن کو مہر کے طور پر طے کرنا فقہ حنفی میں صحیح نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ مہر ایک مالی معاوضہ ہے جو شوہر پر واجب ہوتا ہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتب سے حوالہ جات:

۱- بدائع الصنائع للعلامۃ کاسانی:

"وإذا عقد على تعليم قرآن أو سورة أو على خدمة فلا يصح تسميته مهرا، ولها مهر المثل" (جلد۲، صفحہ۳۲۸)۔

ترجمہ: اگر نکاح قرآن کی تعلیم یا کسی خدمت پر منعقد ہوا تو اس کو مہر کے طور پر مقرر کرنا صحیح نہیں ہے، اور عورت کو مہر مثل ملے گا۔

۲- فتاوی عالمگیریہ:

"من تزوج على تعليم سورة من القرآن أو على تعليم مَا لَايُمْكِنُ أَنْ يَكُونَ مَهْرًا فَإِنَّهَا تَسْتَحِقُ مَهْرَ المثل" (جلد۱، صفحہ۳۰۷)۔

ترجمہ: جو شخص قرآن کی سورت کی تعلیم پر یا ایسی چیز پر نکاح کرے جو مہر نہیں بن سکتی تو عورت کو مہر مثل ملے گا۔

۳- فتح القدیر لابن الہمام:

"ولا تصح تسمية ما لا يصح أن يكون مهرا كتعَلِيمِ قُرْآنٍ أَوْ خِدْمَةٍ فيجب مهر الْمَثْلِ" (جلد۳، صفحہ۷۵)۔

ترجمہ: ایسی چیز کو مہر کے طور پر مقرر کرنا صحیح نہیں ہے جو مہر نہ بن سکتی ہو، جیسے

قرآن کی تعلیم یا خدمت اور مہر مثل واجب ہوگا۔

خلاصہ:

اس مسئلے میں چونکہ مہر مال کے طور پر طے نہیں کیا گیا اور تعلیم قرآن کو مہر بنایا گیا ہے، لہٰذا مہر مثل دینا واجب ہوگا۔ مہر مثل وہ رقم ہوتی ہے جو عورت کے خاندان یا معاشرتی طبقے کی دوسری عورتوں کو دی جاتی ہے، جس کی مقدار عرف و عادات کے مطابق متعین ہوتی ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿کتاب الرضاء﴾

مردہ عورت کا دودھ پینے سے رضاعت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں ایک عورت کا انتقال ہوگیا اس کے انتقال کے بعد ایک بچے اور بچی نے اس کا دودھ پی لیا، اس صورت میں حرمت رضاعت ان دونوں کے درمیان ثابت ہوگی یا نہیں؟ فقہ حنفی کی معتبر اور مستند کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی میں رضاعت سے حرمت اس وقت ثابت ہوتی ہے جب بچے نے زندہ عورت کا دودھ پیا ہو۔ اگر عورت کی وفات کے بعد بچے نے اس کا دودھ پیا تو اس سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی، کیونکہ مرنے کے بعد عورت کے جسم سے نکلنے والے دودھ کی رضاعت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

فقہ حنفی کی کتب سے حوالے:

۱- بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، جلد نمبر ۵، صفحہ نمبر ۱۲۷: "ولو ارتضع من

امرأة میتة أو ارتضع منها بعد موتها لاتثبت الحرمة"۔

۲- الدرالمختار شرح تنویرالابصار، جلد نمبر۲، صفحہ نمبر۴۲۰:"ولا تحرم میتة برضاع لأنها لیست من أهله ولا حرمة للحلیب بعد موت صاحبته"۔

۳- الفتاوی الہندیۃ (المعروف بالفتاوی عالمگیریہ، جلد نمبر۱، صفحہ نمبر:۳۵۱)،

"ولا یثبت التحریم برضاع امرأة میتة"۔

یہ کتب حنفی فقہ کے معتبر مآخذ ہیں اوران میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ مرنے کے بعد عورت کا دودھ پینا حرمت رضاعت کا سبب نہیں بنتا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

عورت کا دودھ برتن میں نکال کر پانی ملا کر بچے کو پلانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک عورت نے اپنا دودھ ایک برتن میں نکال کر اور اس میں پانی ملا دیا اور ایک بچے اور بچی کو دودھ پلا دیا تو کیا دونوں کے درمیان حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی یا نہیں؟ فقہ حنفی کی معتبر و مستند کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً ومصلیاً

فقہ حنفی میں رضاعت سے حرمت کا مسئلہ اس وقت ثابت ہوتا ہے جب بچہ

عورت کا دودھ پیئے اور دودھ پیٹ میں پہنچے، دودھ میں پانی یا کوئی اور چیز ملانے کی صورت میں اگر دودھ غالب ہو تو حرمت رضاعت ثابت ہوجاتی ہے۔

فقہ حنفی کی کتب سے حوالے:

۱-فتح القدیر شرح الہدایہ، جلد نمبر ۳، صفحہ نمبر ۴۲۵

"فإذا خلا اللبن عن الإفساد من غيره فيثبت به الحرمة و إن اختلط بماء فالحكم لما غلب منهما"۔

۲-البحر الرائق شرح کنز الدقائق، جلد نمبر ۴، صفحہ نمبر ۲۰۳

"و إن اختلط اللبن بماء أو غيره و غلب اللبن فإنه يحرم لأنه الأصل"۔

۳-مجمع الأنہر فی شرح ملتقی الأبحر، جلد نمبر ۱، صفحہ نمبر ۴۲۸

"و إذا خالط اللبن ماء أو شئ آخر و غلب اللبن فهو كلبن خالص في التحريم"۔

ان عبارات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر دودھ میں پانی ملایا گیا ہو اور دودھ غالب ہو تو اس دودھ سے پینے والے بچوں کے درمیان رضاعت سے حرمت ثابت ہوجائے گی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

لَبَنُ الْفَحْلِ يَتَعَلَّقَ بِهِ التَّحْرِيْمِ کا مطلب

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ حضرات فقہاء فرماتے ہیں "ولبن الفحل يتعلق به التحريم" تو اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کی تفصیل فقہ حنفی کی کتابوں کی عبارتوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامدا ومصليا

فقہ حنفی میں "ولبن الفحل يتعلق به التحريم" کا مفہوم یہ ہے کہ رضاعت (دودھ پلانے) کی بنا پر حرمت کا حکم اس شخص پر بھی لاگو ہوتا ہے جس کی بیوی نے دودھ پلایا ہے، یعنی رضاعی بھائی بہن کے درمیان نکاح حرام ہو جاتا ہے۔

تفصیل:

ا-رضاعت کی حرمت:

رضاعت کی حرمت اس وقت قائم ہوتی ہے جب بچہ کسی عورت کا دودھ پیتا ہے اور یہ حرمت اس مرد پر بھی لاگو ہوتی ہے جس کا وہ دودھ ہے (یعنی عورت کے شوہر)۔ اس لیے بچہ اس مرد کا رضاعی بیٹا یا بیٹی سمجھا جاتا ہے اور ان کے درمیان وہی رشتہ ہوتا ہے جو نسبی طور پر ہوتا ہے، اور نکاح حرام ہو جاتا ہے۔

فقہ حنفی کی کتابوں سے عبارات:

ا-الدر المختار:

”وَيَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَ مَا يَحْرِم من النسب وصححوا أن لبن الفَحْلِ يُحْرِمُ كَمَا تُحَرِمُ الْمُرْضِعَةُ“۔

رضاعت سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں، اور فقہاء نے تصریح کی ہے کہ دودھ پلانے والے شوہر (فحل) کا دودھ بھی حرمت پیدا کرتا ہے جیسے دودھ پلانے والی عورت (مرضعہ) حرمت پیدا کرتی ہے۔ (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الرضاع)۔

۲-فتاوی عالمگیریہ:

”ويحرم بلبن الْفَحْلِ كَمَا يَحْرُمُ بلبن الأم“۔

”شوہر کے دودھ سے بھی ویسی ہی حرمت پیدا ہوتی ہے جیسے ماں کے دودھ سے پیدا ہوتی“ (الفتاوی الہندیہ، کتاب الرضاع)۔

توضیح:

رضاعت کی حرمت سے مراد یہ ہے کہ دودھ پلانے سے رضاعی رشتہ قائم ہوتا ہے جو نسبی رشتے کی طرح ہوتا ہے۔ اس لیے وہ رشتے جو نسبی طور پر حرام ہیں جیسے بھائی بہن، چچا بھتیجی، ماموں بھانجی وہی حرمت رضاعی رشتہ میں بھی برقرار رہتی ہے۔ اس حرمت کا تعلق اس شخص سے بھی ہوتا ہے جس کی بیوی نے دودھ پلایا ہے، یعنی وہ مرد (فحل) بھی اس بچے کا رضاعی باپ تصور کیا جاتا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

حرمت رضاعت کے لئے صرف مرضعہ کی بات معتبر ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اور علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں زید کا نکاح ایک عورت سے طے پایا نکاح کی تاریخ وغیرہ بھی طے ہوگئی، اس کے بعد ایک عورت نے بتلایا کہ میں نے اس بچی اور اس بچے کو دودھ پلایا ہے، یعنی یہ دونوں رضاعی بھائی بہن ہیں۔ اب سوال یہ ہے کیا حرمت رضاعت میں صرف ایک عورت کی بات قابل اعتبار ہے یا نہیں؟ فقہ حنفی کی مستند اور معتبر کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیا

فقہ حنفی کے مطابق حرمت رضاعت کے ثبوت کے لیے ایک عادل اور ثقہ عورت کی گواہی معتبر سمجھی جاتی ہے، اگر ایسی عورت جو شرعی طور پر معتبر ہو اور معروف ہو کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی، یہ دعوی کرے کہ اس نے مذکورہ لڑکی اور لڑکے کو دودھ پلایا ہے، تو اس کی گواہی پر عمل کیا جائے گا اور حرمت رضاعت ثابت ہوگی۔

فقہ حنفی کی کتب سے حوالے:

۱- الدر المختار شرح تنویر الابصار، جلد نمبر: ۲، صفحہ نمبر: ۴۳۲

”و إذا شهدت امرأة واحدة بالرضاع تقبل شهادتها وتحرم به“۔

۲- البحر الرائق شرح کنز الدقائق، جلد نمبر: ۳، صفحہ نمبر: ۲۸۶

"تحرم الشهادة بالرضاع إذا شهدت به امرأة واحدة عالمة بموضوع الشرع"۔

۳-الفتاوی الهندیہ (المعروف بالفتاوی عالمگیریہ"، جلد نمبر:۱، صفحہ نمبر:۳۵۳)

"و إذا شهدت امرأة واحدة عادلة بالرضاع يثبت التحريم بها"۔

ان عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ اگر ایک عادل اور ثقہ عورت رضاعت کی گواہی دے تو حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

بکری کے دودھ سے حرمت رضاعت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک بچے اور بچی نے ایک بکری کا دودھ ایک ساتھ پی لیا تو اب سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ سے بچی اور بچے کے درمیان حرمت رضاعت ثابت ہوگی یا نہیں؟ فقہ حنفی کی معتبر اور مستند کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامدا ومصليا

فقہ حنفی میں حرمت رضاعت اس وقت ثابت ہوتی ہے جب بچے نے کسی انسان عورت کا دودھ پیا ہو۔ بکری یا کسی دوسرے جانور کا دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ حرمت رضاعت کا اصول صرف انسان کے دودھ پر مبنی ہے۔

فقہ حنفی کی کتب سے حوالے:

۱-الدرالمختار شرح تنویر الأبصار، جلد نمبر۲، صفحہ نمبر: ۴۳۱

"ولا يثبت التحريم بلبن البهائم، لأنه لا يعتبر فى الشرع"۔

۲-البحر الرائق شرح کنز الدقائق، جلد نمبر:۳، صفحہ نمبر: ۲۸۴

"لا تثبت الحرمة برضاع البهائم، لأنه لا يكون سببا للتحريم فى الشرع"۔

۳-الفتاوی الہندیہ (المعروف بالفتاوی عالمگیریہ"، جلد نمبر:۱، صفحہ نمبر: ۳۵۲

"ولا تثبت الحرمة برضاع غير الإنسان، لأنه غير معتبر فى الشرع"۔

ان عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ بکری یا کسی دوسرے جانور کا دودھ پینے سے بچوں کے درمیان حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

مرد کے دودھ سے رضاعت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اور علماء دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک مرد ہے اس کے پستان میں دودھ آتا ہے اس نے اپنا دودھ ایک بچے کو پلا دیا، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کی وجہ سے حرمت رضاعت ثابت ہو جائے

گی یا نہیں؟ فقہ حنفی کی معتبر و مستند کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامدا ومصلیا

فقہ حنفی میں رضاعت کے ذریعے حرمت اس وقت ثابت ہوتی ہے جب دودھ عورت سے پیا جائے، اگر کسی مرد کے پستان سے دودھ نکلے اور کسی بچے نے اسے پی لیا تو اس سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی مرد کا دودھ شرعی اعتبار سے وہ اثر نہیں رکھتا جو عورت کے دودھ سے ہوتا ہے۔

فقہ حنفی کی کتب سے حوالے:

۱-بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، جلد نمبر: ۵، صفحہ نمبر ۱۳۱

"ولا يثبت التحريم برضاع الرجل وإن كان له لبن لأن هذا اللبن ليس من أهله"۔

۲-البحر الرائق شرح کنز الدقائق، جلد نمبر: ۳، صفحہ نمبر ۲۶۷

" لو در ثدی الرجل لبن فأرضع صبيا لا تحرم عليه النساء بذلک"۔

۳-الدر المختار شرح تنویر الأبصار، جلد نمبر: ۲، صفحہ نمبر: ۴۲۹

"ولا تحرم برضاع رجل "۔

یہ کتب حنفی فقہ کے معتبر ماخذ ہیں اور ان میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ مرد کے دودھ سے رضاعت کی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

گود لئے بچہ کو اپنی بہن کا دودھ پلانے کا حکم

سوال: ایک عورت بے اولاد ہے وہ ایک بچے کو گود لینا چاہتی ہے، لیکن وہ تو اسکے حق میں غیر محرم ہوگا جس سے پردہ ضروری ہے، اب وہ چاہتی ہے کہ اپنی بہن سے اس بچے کو دودھ پلوادے تو کیا اسطرح کرنے سے وہ بچہ گود لینے والی عورت کے لئے محرم ہوسکتا ہے۔ جواب عنایت فرمائیں کرم ہوگا۔ فقط والسلام

جواب: الجواب حامداً ومصليا

اسلامی فقہ کے مطابق، اگر ایک عورت کسی بچے کو گود لیتی ہے، تو وہ بچہ اس کے لیے محرم نہیں بنتا، اور ان کے درمیان پردہ لازم رہتا ہے، کیونکہ گود لینا نسبی یا رضاعی (دودھ پلانے والی) رشتہ داری قائم نہیں کرتا۔

تاہم اگر اس بچے کو گود لینے والی عورت کی بہن اس بچے کو دودھ پلاتی ہے تو فقہ حنفی کے مطابق وہ بچہ رضاعی (دودھ سے بننے والی) رشتہ داری کے ذریعے اس عورت کے لیے محرم بن جائے گا۔ یہ اس شرط پر ہے کہ وہ دودھ پلانے کا عمل بچے کی عمر کے پہلے دو سالوں کے اندر ہو اور پیٹ بھر کر دودھ پلایا جائے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب ''الدر المختار'' میں بیان کیا گیا ہے:

''يحرم من الرضاع ما يحرم من النسب'' یعنی رضاع (دودھ پلانے) سے بھی وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔ اس کے مطابق، اگر گود لینے والی عورت کی بہن بچے کو دودھ پلائے تو وہ بچہ اس عورت کا محرم

بن جائے گا اور ان کے درمیان محرمیت قائم (nephew/niece) کے لیے رضاعی بھانجا/ بھانجی ہو جائے گی۔

اسی طرح ''ردالمحتار'' (جو کہ ''الدر المختار'' کی شرح ہے) میں بھی اس مسئلے کی تفصیل دی گئی ہے کہ رضاعی رشتہ داری کس طرح قائم ہوتی ہے اور اس کے احکام کیا ہیں۔

لہٰذا، آپ کے سوال کی روشنی میں، اگر بچے کو گود لینے والی عورت کی بہن اس بچے کو دودھ پلائے تو وہ بچہ اس کے لیے محرم ہو جائے گا، اور اس عورت پر اس بچے کے ساتھ پردہ لازم نہیں رہے گا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿کتاب الطلاق﴾

سونے کی حالت میں طلاق دینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اور علماء دین اس مسئلے کے بارے میں میاں بیوی ایک ساتھ سو رہے تھے، سونے کی حالت میں شوہر نے اپنی بیوی کا نام لے کر تین مرتبہ طلاق دیا جس کو بیوی نے سنا، اٹھنے کے بعد بیوی نے شوہر کو بتایا، شوہر حیران رہ گیا۔ بیوی پریشان ہے فقہ حنفی کی مستند و معتبر کتابوں کے حوالے کے ساتھ اس کا جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی میں طلاق کے وقوع کے لئے نیت اور ارادہ کا ہونا ضروری ہے، اور طلاق کی ادائیگی میں الفاظ کے ساتھ ساتھ نیت کا بھی اعتبار ہے۔ اگر کوئی شخص نیند کی حالت میں ہو اور اس دوران طلاق کے الفاظ ادا کرے تو اس پر طلاق واقع نہیں ہوتی، کیونکہ نیند کی حالت میں انسان کا شعور و ارادہ معطل ہوتا ہے۔

فقہ حنفی کی مستند کتاب ''درمختار'' میں اس حوالے سے وضاحت موجود ہے:

''ولا یقع الطلاق فی النوم، ولو تلفظ بہ، لعدم القصد والعزم''۔

(نیند کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی، چاہے زبان سے الفاظ ادا کیے جائیں، کیونکہ نیت اور ارادہ کا فقدان ہوتا ہے)، (درمختار، کتاب الطلاق، باب موانع الطلاق)۔

اسی طرح ''فتاوی عالمگیری میں بھی یہی مسئلہ موجود ہے:

''و إن طلقها في حال النوم لم يقع الطلاق، لأن الطلاق لايقع إلا باللفظ مع العزم'' (فتاوی عالمگیری، جلد۱، صفحہ ۳۷۴)۔

لہٰذا اس صورت میں شوہر کے نیند کی حالت میں طلاق کے الفاظ ادا کرنے کے باوجود طلاق واقع نہیں ہوئی کیونکہ اس وقت شعور و ارادہ نہیں تھا، اس پر شوہر اور بیوی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور ان کا نکاح قائم ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

طلاق کنائی کے الفاظ اور احکام

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ طلاق کنائی کس کو کہتے ہیں اور اس کے الفاظ کون سے ہیں اور کیا اس میں طلاق کی نیت ضروری ہے اور نیت کرنے سے کون سی طلاق واقع ہوتی ہے، فقہ حنفی کی مستند و معتبر کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصليا

فقہ حنفی میں طلاق کو دو اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے: (۱) طلاق صریح، اور

(۲) طلاق کنائی۔

۱-طلاق صریح:

طلاق صریح وہ ہے جس میں طلاق دینے کے واضح اور معروف الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جیسے ''طلاق''، ''طلاق دے دی''، ''طلاق دیتا ہوں'' وغیرہ۔ ان الفاظ کے استعمال سے نیت کے بغیر بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

۲-طلاق کنائی:

طلاق کنائی وہ ہے جس میں غیر واضح یا مبہم الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو طلاق کا معنی بھی دے سکتے ہیں اور کسی دوسرے معنی بھی۔ اس قسم کی طلاق کے وقوع کے لئے نیت کا ہونا ضروری ہے۔ اگر طلاق کنائی کے الفاظ استعمال کرتے وقت طلاق کی نیت ہو تو طلاق واقع ہو جاتی ہے، ورنہ نہیں۔

طلاق کنائی کے الفاظ:

طلاق کنائی کے الفاظ کی مثالیں درج ذیل ہیں:

''تم میرے لئے حرام ہو''۔

''تم آزاد ہو''۔

''جاؤ اپنے گھر''۔

''تمہیں چھوڑ دیتا ہوں''۔

''اب تم سے کوئی تعلق نہیں''۔

نیت کی اہمیت:

طلاق کنائی کے الفاظ کی صورت میں طلاق کے وقوع کے لئے نیت ضروری ہے۔ اگر نیت ہو تو طلاق واقع ہو جاتی ہے، اور اگر نیت نہ ہو تو طلاق واقع نہیں ہوتی۔

فقہ حنفی کی مستند کتب میں طلاق کنائی کی تعریف اور اس کے الفاظ:

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''الدر المختار'' میں طلاق کنائی کے بارے میں درج ہے:

"والكناية لايقع بها الطلاق إلا بالنية أو دلالة الحال كغضب أو خصومة، ولو لم ينو، كما في الفتح" (الدر المختار، جلد۲، صفحہ ۴۸۸)۔

(کنائی الفاظ سے طلاق اس وقت تک واقع نہیں ہوتی جب تک نیت نہ ہو یا حالات کی دلیل نہ ہو جیسے غصہ یا جھگڑا)۔

اسی طرح ''فتاوی عالمگیری'' میں بھی یہی مسئلہ بیان کیا گیا ہے:

"والكنايات لايقع بها الطلاق إلا بنية أو دلالة الحال" (فتاوی عالمگیری، جلد ۱، صفحہ ۳۷۴)۔

طلاق کی نوعیت:

کنائی الفاظ سے اگر نیت کے ساتھ طلاق دی جائے تو ایک رجعی طلاق واقع ہوتی ہے، بشرطیکہ یہ پہلی یا دوسری طلاق ہو۔ اگر تین طلاقیں دی جائیں تو تین طلاقیں

واقع ہوتی ہیں، اور بیوی پر حرمت مغلظہ ثابت ہوجاتی ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

تیرے ہاتھ کو طلاق کہنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں ایک شخص نے اپنی بیوی کو کسی بات پر یہ کہا تیرے ہاتھ کو طلاق تو فقہ حنفی کی مستند معتبر کتابوں کے حوالے سے بتلائیں اس صورت میں طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی میں طلاق کے وقوع کے لیے صریح اور واضح الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ طلاق کے مفہوم کی وضاحت کی ضرورت ہے، اور کسی مبہم یا غیر واضح لفظ سے طلاق کا حکم نہیں لگایا جاتا۔

کتب فقہ حنفی کی روشنی میں درج ذیل عبارت واضح کرتی ہے کہ غیر واضح یا مبہم الفاظ سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔

۱- بدائع الصنائع کتاب الطلاق، جلد۲، صفحہ۱۱:

"و إذا قال لزوجته: "جعلت يدك طلاقا" فلا يقع الطلاق لأن الطلاق لايكون إلا بلفظ صريح مثل: "طلقتك"۔

۲-ردالمحتار، کتاب الطلاق، جلد۳، صفحہ۳۶۹:

"الطلاق لایکون إلا بلفظ صریح، مثل: "طلاق" أو "طلقت" أو "أنت طالق"۔

یہ عبارت اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ غیر واضح یا مبہم الفاظ جیسے ''تیرے ہاتھ کو طلاق'' سے طلاق کا حکم نہیں لگایا جاتا کیونکہ ان الفاظ میں طلاق کی صراحت نہیں ہوتی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

نشہ کی حالت میں طلاق کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے شراب کے نشے میں اپنی بیوی کو تین طلاق دے دیا اس کی طلاق کا اعتبار کیا جائے گا یا نہیں؟ فقہ حنفی کی معتبر اور مستند کتابوں کے حوالے سے جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً ومصلیاً

فقہ حنفی کے مطابق اگر کسی شخص نے شراب کے نشے میں اپنی بیوی کو طلاق دی ہو تو اس کی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت میں طلاق کے الفاظ کا ارادہ اور نیت کا ہونا ضروری ہے، اور نشے کی حالت میں بھی طلاق دینے والے کا ارادہ اور نیت موجود ہوتی ہے، چاہے وہ نشے کی وجہ سے صحیح طور پر سمجھ نہ رہا ہو۔

اس بارے میں ''بدائع الصنائع'' میں ذکر کیا گیا ہے: ''ولو طلقها وهو سكران يقع طلاقه'' (بدائع الصنائع، جلد۳، صفحہ۲۲۳)، یعنی ''اگر کوئی شخص نشے کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے تو طلاق واقع ہو جائے گی''۔

اسی طرح 'ہدایہ' میں بھی یہی حکم بیان کیا گیا ہے: ''وطلاق السكران واقع'' (ہدایہ، جلد۲، صفحہ۳۳۷)، یعنی ''نشے میں دی گئی طلاق واقع ہوتی ہے''۔

لہٰذا اس صورت میں تین طلاقیں دینے پر بیوی پر تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی، اور بیوی اپنے شوہر پر حرمت مغلظہ کے ساتھ حرام ہو جائے گی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

طلاق شروط کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں ایک شخص نے ایک اجنبیہ عورت سے کہا کہ اگر تم اس گھر میں داخل ہوگئی تو تم کو طلاق، لیکن اس وقت تک اس کا نکاح اس سے نہیں ہوا تھا بعد میں اس سے نکاح ہو گیا اور اس کے بعد وہ عورت اس گھر میں داخل ہوگئی تو فقہ حنفی کے اعتبار سے بتلائیں کہ اس پر طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی کے مطابق اگر ایک شخص نے کسی اجنبی عورت کو مخاطب کرتے ہوئے

کہا کہ ’’اگر تم اس گھر میں داخل ہوگئی تو تم کو طلاق‘‘، اور اس وقت اس عورت سے اس کا نکاح نہیں ہوا تھا، پھر بعد میں اس نے اس عورت سے نکاح کرلیا، اور نکاح کے بعد وہ عورت اس گھر میں داخل ہوگئی، تو اس پر طلاق واقع نہیں ہوگی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ طلاق کا وقوع اس وقت ہوتا ہے جب شوہر اور بیوی کے درمیان نکاح کا رشتہ موجود ہو۔ چونکہ اس شخص نے جب شرط لگائی تو اس وقت عورت اس کی بیوی نہیں تھی، لہٰذا یہ شرط طلاق کے اعتبار سے مؤثر نہیں ہے۔ اس صورت میں طلاق کے الفاظ بعد میں نکاح ہونے کی صورت میں مؤثر نہیں ہوتے۔

یہ مسئلہ فقہ حنفی کی کتابوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ’بدائع الصنائع‘ میں ذکر ہے: ”**ولو قال للأجنبية إذا تزوجتک فأنت طالق لا يقع الطلاق بالتزوج**“ (بدائع الصنائع، جلد۳، ص:۲۳۳)، یعنی (اگر کوئی شخص کسی اجنبی عورت سے کہے کہ اگر میں تم سے نکاح کروں تو تم پر طلاق ہو، تو نکاح ہونے کے باوجود طلاق واقع نہیں ہوگی)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

عورت کہہ رہی ہے شوہر نے مجھ کو طلاق دیا ہے شوہر انکار کررہا ہے اس کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس سوال کے بارے میں کہ ایک عورت کہہ

رہی ہے کہ میرے شوہر نے مجھ کو تین طلاق دیا ہے میں نے خود سنا ہے اور شوہر انکار کر رہا ہے اور کوئی گواہ بھی وہاں پر نہیں ہے تو کس کی بات کا اعتبار کیا جائے گا، فقہ حنفی کی معتبر و مستند کتابوں کے حوالے کے ساتھ بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی کے مطابق اگر عورت یہ دعویٰ کرے کہ اس کے شوہر نے اسے تین طلاقیں دی ہیں اور شوہر اس کا انکار کرے، تو عورت کے قول کی تصدیق اس کے قسم کے ساتھ کی جائے گی۔ اگر شوہر قسم کھا کر طلاق دینے سے انکار کرے، اور وہاں کوئی گواہ موجود نہ ہو تو شوہر کا انکار معتبر ہوگا، اور عورت کے دعوے پر طلاق واقع نہیں ہوگی۔

یہ مسئلہ 'بدائع الصنائع' میں یوں مذکور ہے: "**إذا ادعت المرأة الطلاق والزوج ينكر فالقول قول الزوج مع يمينه**" (بدائع الصنائع، جلد۳، صفحہ۲۹۳)، یعنی (جب عورت طلاق کا دعوی کرے اور شوہر انکار کرے تو شوہر کا قول معتبر ہوگا، بشرطیکہ وہ قسم کھائے)۔

اسی طرح 'ہدایہ' میں بھی یہی حکم بیان کیا گیا ہے: "**ولو ادعت المرأة الطلاق و أنكر الزوج فالقول قوله مع يمينه**" (ہدایہ، جلد۲، صفحہ۴۸۴)، یعنی (اگر عورت طلاق کا دعوی کرے اور شوہر انکار کرے تو شوہر کا قول معتبر ہوگا، بشرطیکہ وہ قسم کھائے)۔

لہٰذا اس صورت میں جب شوہر طلاق دینے سے انکار کر رہا ہو اور کوئی گواہ

موجود نہ ہو تو شرعی طور پر شوہر کے انکار کی تصدیق کی جائے گی، اور عورت کے دعوے پر طلاق واقع نہیں ہوگی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

خلوت صحیحہ سے پہلے تین طلاق کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے شادی کی اور خلوت صحیحہ سے پہلے اس کو تین مرتبہ طلاق دے دیا لیکن طلاق تین اکٹھے نہیں دیا بلکہ ایک ایک کر کے طلاق دیا تو اس صورت میں اس پر کتنی طلاق واقع ہوگی اور اس کا حکم کیا ہے؟ فقہ حنفی کی مستند ومعتبر کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

خلوت صحیحہ سے پہلے دی گئی طلاق کا حکم یہ ہے کہ اگر شوہر نے بیوی کو تین مرتبہ طلاق دی ہو، خواہ وہ طلاقیں ایک ساتھ دی ہوں یا علیحدہ علیحدہ تو وہ تینوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔ اس کے بعد وہ عورت شوہر پر حرام ہوجائے گی اور وہ عورت عدت گزار کر دوسرے شوہر سے نکاح کرنے کی مجاز ہوگی۔ اور اگر وہ دوسرے شوہر سے طلاق کے بعد عدت گزار کر آجائے تو پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کرسکتی ہے۔

فقہ حنفی کی کتاب ''بدائع الصنائع'' میں ہے:

''وإذا طلقها ثلاثا، بأن طلقها واحدة بعد واحدة سواء طلقها

بهن دفعة واحدة أو دفعات، تقع عليها" الثلاث و تبين بها بينونة كبرى، ولا يحل لها أن تزوج بعد بينونة الثلاث إلا بعد أن تنكح زوجا غيره، نكاحا صحيحا، و يدخل بهاالزوج الجديد ثم يفارقها و تنقضى عدتها منه" (بدائع الصنائع، جلد۳، صفحہ۱۰۰)۔

اسی طرح ''بحرالرائق'' میں ہے:

" وإذا طلقها ثلاثا قبل الدخول يحرم عليه نكاحها حتى تنكح زوجا غيره دخولاً حقيقيا" (بحرالرائق، جلد۳، صفحہ۲۹۱)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

تفویض طلاق میں شوہر کی نیت ایک طلاق کی تھی لیکن بیوی نے تین طلاق واقع کرلیا، کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا طلقی نفسک یعنی تو اپنے کو طلاق دے دو اور شوہر نے اس سے ایک طلاق کی نیت کی تھی لیکن بیوی نے اپنے اوپر تین طلاق دے دیا تو کیا اس صورت میں اس پر تین طلاق واقع ہو جائے گی؟ فقہ حنفی کی مستند معتبر کتابوں سے حوالے سے اس کا جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

جب شوہر بیوی کو طلاق کا اختیار دے دیتا ہے، یعنی کہتا ہے: "**طلقی نفسک**" (اپنے آپ کو طلاق دے دو) اور اس سے شوہر کی نیت صرف ایک طلاق دینے کی ہو، تو بیوی کے تین طلاق دینے کی صورت میں بھی شوہر کی نیت کے مطابق ہی طلاق واقع ہوگی، یعنی ایک طلاق واقع ہوگی۔ کیونکہ طلاق کا اختیار دینے والے کی نیت معتبر ہوتی ہے، نہ کہ اختیار استعمال کرنے والے کی نیت۔

فقہ حنفی کی مستند کتاب ''الدر المختار'' میں اس کی وضاحت ملتی ہے:

"ولو قال لها: طلقي نفسک، فطلقت نفسها ثلاثا و نوى الزوج واحدة، وقعت واحدة، لأن النية فى الطلاق "للموكل، لا للوكيل" (الدر المختار مع رد المحتار، جلد۳، صفحہ۲۴۴)۔

اسی طرح ''بدائع الصنائع'' میں بھی ہے:

"ولو قال الزوج: طلقي نفسک ثلاثا، فنوت واحدة أو أكثر، وقعت واحدة، لأن النية فى الطلاق للزوج لا "للزوجة" (بدائع الصنائع، جلد۳، صفحہ۱۰۸)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

مرض الموت میں مطلقہ کو وراثت میں حصہ ملے گا یا نہیں؟

سوال: ایک شخص کی شادی ایک عورت سے ہوئی پوری زندگی دونوں نے ایک ساتھ

گزاری لیکن شوہر نے مرض الموت میں اپنی بیوی کو طلاق بائن دے دیا، اب سوال یہ ہے کہ کیا عورت کی عدت کے زمانے میں اگر شوہر کا انتقال ہو جائے تو بیوی کو شوہر کے ترکے میں وراثت ملے گی یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً ومصلیاً

فقہ حنفی کے مطابق اگر شوہر نے مرض الموت میں اپنی بیوی کو طلاق بائن دے دی اور عدت کے دوران شوہر کا انتقال ہو گیا تو ایسی صورت میں عورت کو شوہر کے ترکے سے وراثت ملے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہ حنفی میں مرض الموت میں دی گئی طلاق بائن کے بعد اگر عدت کے دوران شوہر کا انتقال ہو جائے تو بیوی کو وراثت کا حق حاصل ہوتا ہے۔

فقہ حنفی کی مستند کتاب ''الدر المختار'' میں اس مسئلے کی وضاحت موجود ہے:

"ولو طلقها فی مرض الموت بائنا و مات و هی فی العدة ترثه، لأن البیونة هنا بطریق من جهته" (الدر المختار مع رد المحتار، جلد ۳، صفحہ ۴۴۹)۔

اسی طرح ''بدائع الصنائع'' میں بھی اس مسئلے کا ذکر ہے:

"إذا طلق الرجل امرأته فی مرض الموت طلاقا بائنا، و مات و هی فی العدة، ورثته، لأن الطلاق فی هذه الحالة بمنزلة الفرار" (بدائع الصنائع، جلد ۴، صفحہ ۲۰۴)۔

لہٰذا شوہر کے ترکے سے بیوی کو وراثت ملے گی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

میں طلاق دیتا ہوں انشاء اللہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ان الفاظ کے ساتھ طلاق دیا کہ میں تجھ کو طلاق دیتا ہوں انشاء اللہ۔ تو کیا اس سے اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً ومصلیاً

فقہ حنفی کے مطابق اگر کسی شخص نے طلاق دیتے وقت لفظ ''انشاء اللہ'' کہا تو اس کی نیت پر منحصر ہوگا، اگر اس نے نیت کی تھی کہ وہ طلاق کو مشروط کر رہا ہے اللہ کی مرضی کے ساتھ تو طلاق نہیں ہوگی کیونکہ شرط لگانا معتبر نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کی نیت یہ تھی کہ اللہ کے حکم کے مطابق طلاق دے رہا ہے تو طلاق واقع ہو جائے گی۔

اس مسئلے پر مستند کتاب ''بدائع الصنائع'' میں ذکر ہے۔

بدائع الصنائع، جلد۳، صفحہ ۱۰۰

''ولو قال أنت طالق إن شاء الله تعالىٰ إن أراد به التعليق لم يقع الطلاق لأنه رد الأمر إلى مشيئة الله تعالىٰ و إن أراد به التعظيم وقع لأنه أراد إيقاع الطلاق فقد عزم عليه''۔

البحر الرائق: جلد۳، صفحہ:۲۹۱

''ولو قال لهاأنت طالق إن شاء الله فإن نوى بها التعظيم وقع الطلاق و إن نوى بها التعليق لم يقع لأن ''الطلاق لايحتمل التعليق بالمشيئة''۔

فتح القدیر، جلد ۳، صفحہ ۴۰۳

”وقال فی البحر إن شاء الله تعالیٰ إن أراد به التعظیم یجب الطلاق و إن أراد به التعلیق بالمشیئة لایقع“لأن الطلاق لایحتمل التعلیق بالمشیئة“۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

مطلقہ سے رجوع میں گواہوں کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میاں بیوی کے درمیان کسی بات کو لے کر ان بن ہوگئی اور شوہر نے ایک بار غصے میں کہہ دیا کہ ”میں نے تم کو طلاق دی“ تو اس سے کون سی طلاق واقع ہوگی؟ نیز اس نے عدت کے دوران رجوع کرلیا اور اپنی زبان سے کہہ دیا کہ ”میں تم کو اپنی بیوی بناتا ہوں“ تو کیا اس کہنے کی وجہ سے وہ اس کی بیوی بن جائے گی؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ رجوع کرتے وقت دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ فقہ حنفی کی مستند اور معتبر کتابوں کے حوالوں سے اس کا جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً ومصلیاً

فقہ حنفی کے مطابق اگر شوہر نے ایک بار ”میں نے تمہیں طلاق دی“ کہہ کر طلاق دی ہے تو اس سے ایک رجعی طلاق واقع ہوجاتی ہے۔ رجعی طلاق کے بعد شوہر

کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق ہوتا ہے، اور رجوع کے لیے گواہوں کی موجودگی شرط نہیں ہے۔ رجوع کا اعلان زبان سے کرنا یا ازدواجی تعلقات بحال کرنا یا بیوی کو دل کی نیت سے دوبارہ قبول کرنا کافی ہے۔

رجوع کے لیے گواہوں کی موجودگی ضروری نہیں ہے اور فقہ حنفی میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ رجوع کے وقت گواہوں کی شرط ہو۔ اس لیے اگر شوہر نے عدت کے دوران زبان سے کہہ دیا کہ ''میں تمہیں اپنی بیوی بناتا ہوں'' تو یہ رجوع شمار ہوگا اور بیوی اس کی زوجیت میں واپس آجائے گی۔

اس مسئلے کی تفصیل درج ذیل کتب میں ملتی ہے:

ہدایہ، جلد۲، صفحہ ۳۷۵

''والرجعة فی النكاح بغير حاكم ولا رضاالمرأة، و عند أبی حنيفة وأبی يوسف لايشترط قول ''راجعتک''، بل يكفی الجماع أومايدل على التملک بالفعل''۔

درمختار، جلد۲، صفحہ: ۴۵۵

''ولا يشترط فی الرجعة إشهاد عندنا''۔

بدائع الصنائع، جلد۳، صفحہ ۱۷۸:

''ولايحتاج فی الرجعة إلى إقرار ولاشهود عندنا''۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

معتدہ سے رجوع میں میاں بیوی کے درمیان اختلاف کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک طلاق یا دو طلاق دیا اور عدت کے اندر اس نے رجوع کر کے اپنی بیوی بنا لیا۔ لیکن عدت گزرنے کے بعد بیوی یہ کہتی ہے کہ تم نے رجوع نہیں کیا تو اس صورت میں کس کی بات کا اعتبار ہوگا؟ شوہر کی بات کا یا بیوی کی بات کا؟ فقہ حنفی کی معتبر اور مستند کتابوں کے حوالے سے اس کا جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی کے مطابق اگر شوہر اور بیوی کے درمیان رجوع کے معاملے میں اختلاف ہو جائے اور شوہر یہ دعوی کرے کہ اس نے عدت کے اندر رجوع کیا تھا جبکہ بیوی اس کا انکار کرے، تو اس صورت میں بیوی کے انکار کی صورت میں شوہر پر قسم واجب ہوگی کہ اس نے رجوع کیا ہے۔ اگر شوہر قسم کھا لیتا ہے تو اس کی بات معتبر ہوگی اور رجوع ثابت ہو جائے گا، اگر شوہر قسم کھانے سے انکار کرتا ہے تو بیوی کے انکار کا اعتبار ہوگا، اور طلاق بائن شمار ہوگی۔

اس مسئلے کی وضاحت درج ذیل کتب میں موجود ہے:

درمختار، جلد ۳، صفحہ ۳۵۰

"ولو ادعى الزوج الرجعة و أنكرتها، قيل: القول له بيمينه لأنه منكر للطلاق البائن"۔

بدائع الصنائع، جلد۳، صفحہ ۱۸۷

"و كذلك إذا أنكرت الرجعة و قال راجعتها فالقول قوله بيمينه لأنه منكر للفراق، و إن نكل فهي بائن"۔

فتاوی ہندیہ، جلد۱، صفحہ ۵۰۳

"ولو اختلفا في الرجعة فقال الزوج قد راجعتک و أنكرت المرأة، فإن كان في مجلس واحد فالقول قول المرأة، و إن كان في مجالس فالقول قول الزوج بيمينه"۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

معتدہ سے نکاح کا حکم

سوال: ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق بائن دے دیا، اس کے بعد اس کی بیوی عدت میں بیٹھ گئی۔ چند دنوں کے بعد عدت ہی کے دوران کسی شخص نے کسی عالم کو بلا کر اس سے نکاح کر لیا تو سوال یہ ہے کہ کیا عدت کی حالت میں اس کا نکاح صحیح ہوا یا نہیں؟ فقہ حنفی کی معتبر اور مستند کتابوں کے حوالوں سے اس کا جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً ومصلیا

فقہ حنفی کے مطابق اگر کسی عورت کو طلاق بائن ہو جائے اور وہ عدت کے

دوران ہو تو اس حالت میں اس کا نکاح کسی دوسرے مرد سے کرنا جائز نہیں ہے۔ عدت کے دوران نکاح کرنا حرام ہے اور ایسا نکاح شرعی طور پر منعقد نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر کسی عورت نے عدت کے دوران کسی دوسرے مرد سے نکاح کیا تو وہ نکاح غیر مؤثر اور باطل ہو گیا۔

اس مسئلے کی تفصیل درج ذیل کتب میں ملتی ہے:

فتاوی عالمگیری (فتاوی ہندیہ)، جلد ۱، صفحہ ۲۸۴

"و من طلق امراته طلاقا بائنا أو طلاقا رجعيا فلا يحل له أن يتزوجها في عدتها من غيره"۔

ہدایہ، جلد ۱، صفحہ ۲۲۵

"ولو تزوجت المرأة في عدتها من طلاق بائن لم يجز و يفرق بينهما"۔

ردالمحتار، جلد ۲، صفحہ ۵۰۹

"لايجوز نكاح المعتدة من طلاق بائن، ولو وقع فرق بينهما"۔

یہ حوالہ جات ثابت کرتے ہیں کہ عدت کے دوران نکاح کرنا باطل ہے اور ایسا نکاح غیر مؤثر ہوتا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

مطلقہ کا عدت کے بعد شوہر کے گھر رہنے کا حکم

سوال: مسئلہ درپیش یہ ہے کہ عمر رسیدہ زوجین تھے اور طلاق کی نوبت آ گئی، اب جوان کی منکوحہ تھی، بجائے میکے رہنے کے وہ اپنے سسرالی میں اپنے جوان بچوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ اب اس میں شکل ان لوگوں نے یہ اپنائی ہے کہ اوپر بالا خانے میں وہ رہیں گے اور نیچے کے کمروں میں اپنے لڑکوں کے ساتھ وہ عورت رہے گی۔ تو اس میں تو بعض لوگوں نے اجازت دی ہے، بعض لوگ اجازت نہیں دے رہے ہیں۔ اجازت دینے والوں کا یہ کہنا ہے کہ کیونکہ وہ عمر رسیدہ ہے اور فتنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے اور احتیاط کے ساتھ رہنا سہنا ہوگا، تو اس لئے اجازت اس کو ہے، اور جو لوگ اجازت نہیں دے رہے ہیں وہ کہہ رہے ہیں کہ مناسب نہیں ہے نیا دروازہ کھلے گا فتنے کا، اس میں جناب والا کی کیا رائے ہیں؟ اگر جائز نہیں ہے تو کوئی ایسی شکل ذہن میں ہو تو بتلائیں جس سے ان لوگوں کی رہنمائی کی جا سکے۔ امید ہے کہ اس پر غور فرماتے ہوئے جواب عنایت فرمائیں گے۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیا

فقہ حنفی کے اصولوں کے مطابق طلاق کے بعد عورت کا عدت کی مدت تک شوہر کے گھر رہنا واجب ہے، بشرطیکہ شوہر کی طرف سے اسے نکالے جانے یا کسی اور ضرر کا

اندیشہ نہ ہو۔ عدت کی تکمیل کے بعد عورت خود مختار ہے اسے اپنی مرضی سے رہائش اختیار کرنے کا حق ہے، لیکن شرعی نقطۂ نظر سے چند باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ اختلاط (مرد و عورت کا اختلاط): عورت کو غیر محرم مردوں کے ساتھ رہنے سے بچنا چاہئے۔ جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے، اگر عورت اپنے بالغ بچوں کے ساتھ رہتی ہے اور اس کی اور بچوں کی رہائش علیحدہ ہو، یعنی ان کی ملاقات اور اختلاط سے بچنے کے لئے واضح حدود ہوں تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر اس میں فتنے کا اندیشہ ہو یا عورت اور غیر محرم مردوں کے درمیان پردے کا خیال نہ رکھا جائے تو اس سے بچنا ضروری ہے۔

۲۔ فتنے کا اندیشہ: بعض علماء فتنے کے خدشے کے باعث ایسے انتظامات کو ناپسند کرتے ہیں، خصوصاً جب غیر محرم مرد و عورت ایک ہی گھر میں رہتے ہوں، چاہے وہ مختلف حصوں میں ہی کیوں نہ ہوں، یہاں پر فتنے کے خدشات کو مدنظر رکھتے ہوئے احتیاط ضروری ہے۔

۳۔ مسکن کا اہتمام: اگر عورت کو اپنی سسرال میں رہنے کی اجازت دی جائے تو یہ ضروری ہے کہ اس کے اور باقی مرد اراکین کے درمیان پردے اور اختلاط سے بچاؤ کے مناسب انتظامات ہوں، اس کے علاوہ بہتر یہ ہوگا کہ عورت خود یا کسی محرم مرد کے ساتھ رہائش اختیار کرے، تاکہ کسی بھی قسم کے فتنے یا شک کی گنجائش نہ رہے۔

فقہ حنفی کی مستند کتب سے متعلق مسئلے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ:

الدر المختار مع رد المحتار، جلد ۳، صفحہ ۶۴۴

"و یجب علی المعتدة ملازمة المنزل الذی مات زوجها فیه أو طلقت فیه"۔

بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، جلد۳، صفحہ۲۶۱

"ومنها أن لاتخرج المرأة فی عدة الطلاق من مسکن النکاح"۔

البحر الرائق شرح کنز الدقائق، جلد۴، صفحہ۱۴۲

"والحرة إذا کانت معتدة فإن کانت بائنا وجب علیها أن تعتدی فی بیتها"۔

ان حوالوں کی روشنی میں بنیادی اصول یہی ہے کہ طلاق یا عدت کے دوران عورت کا اپنے مسکن میں رہنا واجب ہے، عدت کے بعد اسے آزادی ہے، لیکن شرعی حدود میں ضوابط کی پابندی کرنا ضروری ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی کے مطابق طلاق کے بعد عدت کی مدت پوری کرنے کے بعد عورت اپنی مرضی کے مطابق رہائش اختیار کرسکتی ہے، بشرطیکہ اس کا رہنا شرعی حدود کے اندر ہو۔ اگر وہ اپنے محرم (یعنی اپنے بیٹوں) کے ساتھ رہ رہی ہے اور ان کے اور اس کے سابق شوہر کے درمیان کوئی اختلاط نہیں ہے تو یہ جائز ہے، بشرطیکہ:

۱- پردے کا اہتمام: عورت اور غیر محرم مردوں کے درمیان پردے کا اہتمام ہو۔

۲- فتنے سے بچاؤ: فتنے کا اندیشہ نہ ہو اور عورت اور اس کے سابق شوہر کے درمیان کوئی تعلق یا رابطہ نہ ہو۔

فقہ حنفی کی مستند کتب میں اس طرح کے حالات کے بارے میں واضح ہدایات موجود ہیں کہ عدت کے بعد عورت کو اپنی مرضی کے مطابق رہائش کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ وہ شرعی حدود میں ہو۔

بدائع الصنائع، جلد ۳، صفحہ ۲۶۱

"ومنها أن لاتخرج المرأة فى عدة الطلاق من مسكن النكاح"۔

البحر الرائق شرح کنز الدقائق، جلد ۴، صفحہ ۱۴۲

"والحرة إذا كانت معتدة فإن كانت بائنا وجب عليها أن تعتد في بيتها"۔

ان حوالوں سے یہ واضح ہے کہ عدت کے بعد عورت اپنی مرضی کے مطابق مگر شرعی حدود کے تحت رہائش اختیار کر سکتی ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

"أنت علی حرام" کہنے کا حکم

سوال: ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا "أنت علی حرام" (تم مجھ پر حرام ہو)، اس کا کیا حکم ہے؟ کیا اسے طلاق سمجھا جائے گا یا کچھ اور؟ فقہ حنفی کی معتبر کتابوں کے حوالے سے مدلل جواب دیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی میں حکم:

فقہ حنفی کے مطابق جب کوئی شوہر اپنی بیوی کو "أنت علی حرام" کہے تو اس کا حکم نیت پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر شوہر کی نیت طلاق کی تھی، تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ اگر اس کی نیت طلاق کی نہیں تھی بلکہ قسم کی تھی تو یہ قسم شمار کی جائے گی اور اس کا کفارہ لازم ہوگا، اگر شوہر کی نیت غیر واضح ہو تو علماء کے اختلافات موجود ہیں۔

حوالہ جات:

۱- الدر المختار مع رد المختار (ابن عابدین شامی)، جلد۳، صفحہ۳۳۲

"قوله: أنت علی حرام إن نوی به الطلاق وقع ...... و إن نوی به الظهار صار ظهارا و إن نوی به الیمین کان یمینا و إن لم ینو شیئا لم یلزمه شئ عندهٗ"۔

ترجمہ: (اگر شوہر نے "أنت علی حرام" کے الفاظ کے ساتھ طلاق کی نیت کی، تو طلاق واقع ہو جائے گی......اور اگر ظہار کی نیت کی تو یہ ظہار ہو جائے گا، اور اگر قسم کی نیت کی تو یہ قسم شمار ہوگی، اور اگر اس نے کچھ نیت نہیں کی تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک کچھ لازم نہیں ہوگا۔

۲- الفتاوی الہندیہ، جلد۱، صفحہ۳۵۷

"قوله: أنت علی حرام ینوی به الطلاق طلقت"۔

ترجمہ: (اگر 'أنت علی حرام' کہنے والے نے طلاق کی نیت کی تو طلاق واقع ہو جائے گی۔

نتیجہ: اگر شوہر نے ''أنت علی حرام'' کہہ کر طلاق کی نیت کی تو ایک طلاق رجعی واقع ہوگی، اگر نیت قسم کی ہے تو قسم کا کفارہ لازم ہوگا، اگر نیت واضح نہیں ہے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک کچھ لازم نہیں ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

مطلقہ مغلظہ اگر حلالہ کا اقرار کرے تو کیا حکم ہے؟

سوال: ایک عورت کو اس کے شوہر نے تین طلاقیں دے دیں، چند مہینوں کے بعد وہ عورت اپنے پہلے شوہر کے پاس آئی اور اس نے کہا کہ ''میں نے ایک دوسرے شخص سے نکاح کیا تھا، اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کیے، اور پھر اس نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ اب میں آپ سے دوبارہ نکاح کرنا چاہتی ہوں۔'' سوال یہ ہے کہ کیا اس صورت میں عورت کے بیان پر اعتبار کرتے ہوئے پہلا شوہر اس سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

سوال کا پس منظر:

جب کسی عورت کو اس کے شوہر نے تین طلاقیں دے دی ہوں تو وہ عورت

اس پر حرام ہو جاتی ہے جب تک کہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کر لے اور اس سے ازدواجی تعلقات قائم نہ کر لے۔ اس کے بعد اگر دوسرا شوہر اسے طلاق دے دیتا ہے یا اس کی وفات ہو جاتی ہے، تو عدت کے بعد پہلا شوہر اس سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔ اس عمل کو شرعی اصطلاح میں ''حلالہ'' کہا جاتا ہے۔

عورت کے بیان کی قبولیت:

فقہ حنفی کے مطابق اگر کوئی عورت دعوی کرتی ہے کہ اس نے دوسرے شخص سے نکاح کیا تھا، اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کیے اور پھر اس سے طلاق حاصل کی تو اس عورت کے بیان پر اعتبار کیا جائے گا جب تک کہ اس کے خلاف کوئی شرعی شہادت موجود نہ ہو۔

مستند کتب کے حوالہ جات:

۱- الدر المختار مع رد المحتار (ابن عابدین شامی)، جلد۳، صفحہ ۳۹۴

اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر عورت خود یہ کہتی ہے کہ اس نے دوسرے مرد سے نکاح اور جماع کے بعد طلاق حاصل کی ہے، تو اس کا بیان معتبر سمجھا جائے گا۔

۲- فتح القدیر (ابن ہمام)، جلد۳، صفحہ ۴۸۵:

یہاں بیان کیا گیا ہے کہ عورت کے بیان کی قبولیت کے اصول کیا ہیں اور اس کی شرائط کیا ہیں۔

۳-فتاوی ہندیہ، جلد ۱، صفحہ ۳۵۴:

اس کتاب میں طلاق ثلاثہ کے بعد دوبارہ نکاح کے مسائل اور حلالہ کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

نتیجہ: اگر عورت کے بیان کے خلاف کوئی واضح شرعی شہادت موجود نہ ہو تو اس کے بیان پر اعتبار کرتے ہوئے پہلا شوہر اس سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

طلاق دینے کا مسنون طریقہ

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اور علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ طلاق دینے کا سنت طریقہ کیا ہے؟ فقہ حنفی کی مستند اور معتبر کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامدا ومصلیا

طلاق دینے کا سنت طریقہ یہ ہے کہ مرد اپنی بیوی کو طہر (پاکی کی حالت) میں جب کہ اس طہر میں اس کے ساتھ جسمانی تعلق نہ قائم کیا ہو، ایک طلاق رجعی دے۔ اس کے بعد عدت کے دوران عورت کو گھر میں رکھے اور اس پر خرچ بھی کرے، تاکہ اگر مرد چاہے تو اس دوران رجوع کر سکے۔ یہ طریقہ قرآن اور سنت کے مطابق

ہے اور اس میں مرد وعورت دونوں کے لیے سہولت اور بہتری ہے۔

فقہ حنفی کی کتب سے حوالے:

۱-الدر المختار شرح تنویر الأبصار، جلد نمبر ۳، صفحہ نمبر: ۴۰۶

"السنة فی الطلاق أن يطلقها واحدة فی طهر لم يجامعها فيه، ثم يتركها حتى تنقضی عدتها"۔

۲-البحر الرائق شرح کنز الدقائق، جلد نمبر: ۴، صفحہ نمبر: ۶۸

"وهو أن يطلقها فی طهر لم يجامعها فيه، ثم يتركها حتى تنقضی عدتها، فهذا هو الطلاق السنی"۔

۳-الفتاوی الهندية المعروف بالفتاوی عالمگیریہ، جلد نمبر: ۱، صفحہ نمبر: ۳۴۷

"السنة أن يطلقها واحدة فی طهر لم يجامعها فيه"۔

ان عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ سنت کے مطابق طلاق دینے کا طریقہ وہ ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دینے پر شوہر کو کیا دینا ہوگا؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں

کہ زید نے ایک عورت سے نکاح کیا لیکن خلوت صحیحہ سے پہلے زید نے اپنی بیوی کو طلاق دے دیا تو اس صورت میں زید کے ذمے اپنی مطلقہ بیوی کو کیا کیا دینا ہوگا؟

جواب: الحواب حامدا ومصليا

فقہ حنفی کے مطابق اگر شوہر نے اپنی بیوی کو خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دے دی تو اس پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہی:

نصف مہر (آدھا مہر): نکاح کے وقت جو مہر مقرر کیا گیا تھا، اس کا نصف حصہ ادا کرنا ضروری ہے۔ اگر مہر مقرر نہیں کیا گیا تھا تو متعہ دینا ہوگا۔

عدت: چونکہ خلوت صحیحہ نہیں ہوئی، اس لیے عورت پر عدت کی پابندی نہیں ہوگی، لیکن طلاق بائن کی صورت میں ایک حیض عدت ہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتب سے حوالہ جات:

۱-بدائع الصنائع للعلامۃ کاسانی:

"وإذا طلق قبل الدخول والخلوة الموجبة للمهر فعليه نصنف المهر المسمى لقوله تعالى: وَإِن طلقتُموهُنَّ من قبل أن تمسو هن وقد فرضتم لهن فريضة فنصف ما فرضتم" (جلد۲، صفحہ۳۲۲)۔

ترجمہ: اگر شوہر نے دخول یا خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دے دی، تو اس پر مقررہ مہر کا نصف واجب ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اگر تم نے ان سے مباشرت

سے پہلے طلاق دی اور تم نے ان کے لیے مہر مقرر کیا تھا، تو اس کا نصف ادا کرو"۔

۲- فتاوی عالمگیریہ:

"وإذا طلق زوجتة قبل الخلوة الموجبة للمهر فلها نصف المهر المسمى" (جلد۱، صفحہ۳۵۴)۔

ترجمہ: اگر شوہر نے خلوت صحیحہ سے پہلے اپنی بیوی کو طلاق دی، تو اس کے لیے مقررہ مہر کا نصف واجب ہے۔

۳- فتح القدیر لابن الہمام:

"وإذا طلق قبل الخلوة الموجبة فإن كان قد سمى لها مهرًا فلها نصفة" (جلد۴، صفحہ۱۵۰)۔

ترجمہ: اگر شوہر نے خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دی اور مہر مقرر کیا گیا تھا، تو اس کا نصف بیوی کے لیے واجب ہوگا۔

عدت کے بارے میں:

خلوت صحیحہ نہ ہونے کی وجہ سے عدت نہیں ہوگی لقولہ تعالیٰ و ان طلقتموهن من قبل ان تمسواهن فما لكم عليهن من عدة تعتدونها

(سورہ احزاب، آیت:49)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

متعہ کس کو کہتے ہیں؟ اور اس کی ادائیگی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ حضرات فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ ہر مطلقہ کو متعہ دیا جائے، اب سوال یہ ہے کہ متعہ کس کو کہتے ہیں؟ اور اس کا دینا کیا واجب ہے یا فرض؟ اگر کوئی نہ دے تو کیا گنہگار ہوگا؟

جواب: الجواب حامدا ومصلیا

فقہ حنفی کے مطابق متعہ ایک مالی امداد ہے جو طلاق یافتہ عورت کو دی جاتی ہے۔ اس کا مقصد طلاق کے بعد عورت کی دلجوئی اور مدد کرنا ہے، متعہ کی ادائیگی کا حکم اس وقت خاص طور پر ہے جب عورت کو مہر ادا نہیں کیا گیا ہو یا اس کی حیثیت کمزور ہو۔

متعہ کی تعریف:

متعہ اس مال کو کہا جاتا ہے جو طلاق کے بعد شوہر کی طرف سے دی جاتی ہے، تا کہ عورت کی کچھ مالی امداد ہو سکے۔

متعہ کی حیثیت:

فقہ حنفی میں متعہ واجب نہیں ہے، بلکہ مستحب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو دینا اچھا اور پسندیدہ عمل ہے، مگر اس کا ترک کرنا گناہ نہیں۔ یہ ایک قسم کی اخلاقی

اور معاشرتی ذمہ داری ہے، جسے ادا کرنا بہتر سمجھا جاتا ہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتب سے حوالہ جات:

۱-بدائع الصنائع للعلامۃ کاسانی:

"وأَمَّا الْمُتْعَة فَإِنَّهَا مَنْدُوبٌ إِلَيْهَا عِنْدَنَا وَلَا تَجِب" (جلد۳،صفحہ۲۱۲)۔

ترجمہ: متعہ ہمارے نزدیک مستحب ہے اور واجب نہیں۔

۲-فتاوی عالمگیری:

"ولا تجب المتعة فی طلاق المرأة، ولکنها مندوب إلیها" (جلد۱،صفحہ۵۴۲)۔

ترجمہ: طلاق کے وقت متعہ واجب نہیں ہے، لیکن مستحب ہے۔

۳-فتح القدیر لابن الہمام:

"والمتعة عندنا مندوبة لا واجبة" (جلد۴،صفحہ۸۸)۔

ترجمہ: متعہ ہمارے نزدیک مستحب ہے، واجب نہیں۔

خلاصہ:

متعہ دینا فقہ حنفی میں مستحب ہے، یعنی اگر شوہر دے تو یہ اچھا عمل ہے، لیکن اگر نہ دے تو اس پر گناہ نہیں ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

خلع کے بعد طلاق دینے کا حکم

سوال: اگر میاں بیوی میں تعلقات خوشگوار نہ ہوں اس کی وجہ سے بیوی شوہر سے خلع حاصل کر لے تو خلع کے بعد شوہر کو طلاق دینا ہوگا؟ یا خلع کافی ہے وہ طلاق کے درجے میں ہے۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

خلع کے معاملے میں فقہ حنفی کے مطابق اگر بیوی شوہر سے کچھ مالی معاوضہ کے عوض خلع حاصل کرتی ہے تو اس کے نتیجے میں نکاح فسخ ہو جاتا ہے اور شوہر کو علیحدہ سے طلاق دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خلع خود بخود طلاق بائن کے درجے میں شمار ہوتا ہے، جس سے نکاح مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے۔

بدائع الصنائع میں اس حوالے سے کہا گیا ہے:

"**والخلع فسخ نکاح علی أصح القولین**" (بدائع الصنائع، ج۴ ص ۹۸)۔

ترجمہ: اور خلع کے بارے میں صحیح ترین قول کے مطابق یہ نکاح کو فسخ کر دیتا ہے۔

فتاوی ہندیہ میں ذکر ہے:

"**الخلع طلاق بائن**" (الفتاوی الھندیہ، ج۱، ص۳۵۴)۔

ترجمہ: خلع طلاق بائن کے درجے میں ہے۔

درمختار میں بھی اسی طرح ذکر ہے:

"**الخلع طلاق بائن**" (ردالمحتار علی الدر المختار، ج۳، ص۴۸۶)۔

ترجمہ: خلع طلاق بائن کے حکم میں ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

رخصتی سے پہلے طلاق ومہر کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں، علماء دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں مثلا زید نے ہندہ سے عقد یعنی نکاح کیا، لیکن رخصتی نہیں ہوئی تھی، اور نہ میاں بیوی کی تنہائی میں ملاقات ہوئی تھی، اب کسی مجبوری کی وجہ سے نہ زید ہندہ کو اپنی بیوی بنا کر ازدواجی زندگی گزارنا چاہتا ہے، اور نہ ان کے والدین، اس رشتہ سے راضی ہیں۔ ایسی صورتحال میں شرعی نقطہ نظر سے کیا حکم ہے، کیا دین مہر بھی ادا کرنا پڑے گا؟ اگر پڑے گا تو کتنا؟ اس کی صورت کیا ہوگی؟ ادا کرنے کی قرآن وحدیث اور فقہ حنفی کی مستند ومعتبر کتابوں کے حوالوں سے جواب مرحمت فرمائیں گے۔ فقط

جواب: الجواب حامداً ومصلیا

زید اور ہندہ کے نکاح کے بعد اگر رخصتی نہیں ہوئی اور نہ ہی میاں بیوی کی تنہائی میں ملاقات ہوئی، اور اب زید اس نکاح کو باقی نہیں رکھنا چاہتا اور دونوں کے والدین بھی اس رشتہ سے راضی نہیں ہیں، تو ایسی صورت میں شریعت کے مطابق زید کو اختیار ہے کہ وہ ہندہ کو طلاق دے سکتا ہے۔

اگر زید طلاق دیتا ہے اور رخصتی یا خلوت صحیحہ یعنی ایسی تنہائی جس میں مباشرت ممکن ہو، نہیں ہوئی ہے، تو زید پر پورا مہر واجب نہیں ہوتا بلکہ نصف مہر واجب ہوتا ہے، یعنی زید کو نصف مہر ادا کرنا پڑے گا۔

ادائیگی کی صورت یہ ہوگی کہ اگر مہر معین تھا، تو اس کا نصف زید کو ادا کرنا ہوگا، اور اگر مہر معین نہیں تھا، تو اس صورت میں اس کو متعہ دیا جائے گا جو شوہر کی حیثیت کے مطابق ہوگا (ہدایہ، جلد۲، ص:۳۱۵)۔

و ان لم يسم لها مهراً وطلقها قبل الدخول فعلىٰ الموسع قدره و على المقتر قدره وهكذا فى المبسوط ج ۵، ص: ۲۳۔

دلائل:

۱-قرآن کریم:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وإن طلقتموهن من قبل أن تمسوهن وقد فرضتم لهن فريضة فنصف ما فرضكم " (سورۃ البقرۃ:۲۳۷)۔

ترجمہ: اور اگر تم ان کو اس حال میں طلاق دے دو کہ تم نے ان کو ہاتھ نہ لگایا ہو، حالانکہ ان کے لیے مہر مقرر کر چکے ہو تو اس مقررہ مہر کا نصف دینا ہوگا۔

۲-فقہ حنفی:

فقہ حنفی کی معتبر کتاب ''بدائع الصنائع'' میں بھی اس مسئلے کو اسی طرح بیان کیا

گیا ہے۔

"وإن طلقها قبل الدخول وقد سمى لها مهرا فلها نصف المهر" (بدائع الصنائع، کتاب النکاح)۔

نتیجہ:

لہٰذا زید کو طلاق دینے کا اختیار ہے اور رخصتی یا خلوت صحیحہ نہ ہونے کی صورت میں نصف مہر ادا کرنا ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

طلاق معلق کا حکم

سوال: ایک شخص نے کہا کہ اگر فلاں کے جنازے میں شریک ہوا تو میں طلاقی ہوں گا، میری بیوی کو طلاق ہوگی، حالانکہ اس نے ابھی نکاح نہیں کیا ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ کیا نکاح کرنے کے بعد اس کی بیوی پر طلاق واقع ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

صورت مسئولہ میں نکاح کرنے کے بعد اس کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔

رجل قال: ان فعل كذا، فإمرأته طالق و ليس له امرأة، فتزوج امرأة ثم فعل ذالک لايحنث في يمينه (فتاوی قاضی خاں ۱/۵۱۱، رشیدیہ، وہکذا فی فتاوی محمودیہ ۱۲/۲۵۷)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

شوہر کا بیوی سے کہنا میں تمہیں آزاد کرتا ہوں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو یہ الفاظ کہے کہ میں تم کو اپنی زندگی سے دور کرتا ہوں، میں تمہیں یعنی بیوی تسلیم نہیں کرتا، میں تمہیں آزاد کرتا ہوں تو کیا یہ کہنے سے طلاق ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً ومصلیاً

صورت مسئولہ میں اگر شوہر نے یہ الفاظ طلاق کی نیت سے کہے ہیں تو ایک طلاق بائن واقع ہو جائے گی اور اگر طلاق کی نیت نہیں تھی تو طلاق واقع نہیں ہوگی اور میں تمہیں آزاد کرتا ہوں یہ جملہ طلاق کے لئے الفاظ صریحہ میں سے ہے، لہٰذا اس سے طلاق رجعی واقع ہو جائے گی اور اس طرح طلاق رجعی اور طلاق بائن دونوں مل کر دو طلاق بائن ہو جائیں گی اور اس صورت میں تجدید نکاح ضروری ہوگا اور بعد میں صرف ایک طلاق کا وہ مالک رہے گا۔

الصریح یلحق الصریح و یلحق البائن و البائن یلحق الصریح (الدر المختار، الطلاق/للکنایات/۷/۴۰ ۵، زکریا، دیو بند)۔

ان الصریح مالم یستعمل الا فی الطلاق من ای لغة کانت الخ سرحتک وھو "رھا کردم" لانه صار صریحاً فی العرف (شامی الطلاق/الکنایات/۴/۴۳۰، زکریا)۔

إذا طلق الرجل امرأته تطليقة رجعية فله ان يراجعها في عدتها (ہندیہ الباب السادس فی الرجعۃ وفیما تحل بہ المطلقۃ وما یتصل بہ ۱/۴۷۰، زکریا قدیم)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

میری طرف سے سمجھ لو ختم ہے کہنے کا حکم

سوال: میرے شوہر دو سال پہلے ستر، اسی لاکھ سے زیادہ شیئر بازار میں کھو چکے ہیں، یہ قیمت انہوں نے لوگوں سے بطور قرض لی تھی جس میں میں نے بھی ان کو دس لاکھ پچاس ہزار روپئے لون لے کر دیئے تھے، اس شرط پر کہ جو قسط آئے گی وہ دیں گے کیونکہ میری اتنی تنخواہ نہیں ہے، ایسے وقت میں گھر کے سارے اخراجات میں ہی اپنی کمائی سے پورے کر رہی ہوں، اس دوران وہ مجھ سے اچھے سلوک بھی نہیں کر رہے ہیں، ہر وقت یہی طعنہ دینا کہ میری وجہ سے یہ سب حالات آئے تو ایسی صورت میں میری نوکری بھی خطرے میں پڑ گئی اور میں بھی ان سے عاجز آ گئی

تو میں نے ان سے کہا کہ اگر میری وجہ سے حالات ہیں اور تم میری نوکری بھی
چھڑوار ہے ہوتو اس رشتے ہی کو ختم کر کے بلا نوکری والی کوئی لے آ ؤ، اسی طرح وہ
مجھ سے ہر روز جھگڑا کرتے رہے تو دو دن پہلے بھی بحث و مباحثہ ہوا، پھر جب
انہوں نے مجھ سے کہا کہ تمہاری ہی وجہ سے یہ سب ہوا تو میں نے کہا جو اس کا حل
میں پہلے بتا چکی ہوں، یعنی طلاق تو اس پر عمل کرلو اس پر انہوں نے بولا کہ ایسی ہی
چاہتی ہو تو میری طرف سے سمجھ لو ختم ہے۔ جبکہ اس سے پہلے وہ مجھے دو طلاق دے
چکے ہیں، لہٰذا صورت مذکورہ میں طلاق ہو گی یا نہیں؟ میری ماں نے جب ان سے
پوچھا تو بتایا کہ میں نے دل میں طلاق دینے کی نیت نہیں کی تھی۔

جواب: الجواب حامداً ومصلیاً

برصدق سوال صورت مسئولہ میں ''میری طرف سے سمجھ لو ختم ہے'' یہ جملہ کنایہ ہے، مذاکرۂ طلاق کے بعد اس جملہ سے بلا نیت ایک طلاق بائن واقع ہوگئی، سابق دو طلاق مل کر تین طلاق ہوگئیں، لہٰذا بلا حلالہ شرعی کے دوبارہ زوجیت میں نہیں آ سکتی (مستفاد: احسن الفتاوی، ج:۵، ص:۱۹۳)۔ **فالكنايات لا تطلق بها إلا بنية أو دلالة الحال وهي حالة مذاكرة الطلاق أو الغضب ...... و أما مثل رداً ونحو خلية و برية أى يصح جواباً أيضا خلية حالته عن النكاح أو عن الخير** (شامی، زکریا، کتاب الطلاق، ص:۵۲۸-۵۲۹)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم
مفتی حبیب اللہ قاسمی

رخصتی سے پہلے طلاق اور مہر کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں، علماءدین مفتیان شرع متین مسلہ ذیل کے بارے میں، مثلا زید نے ہندہ سے عقد یعنی نکاح کیا، لیکن رخصتی نہیں ہوئی تھی اور نہ میاں بیوی کی تنہائی میں ملاقات ہوئی تھی، اب کسی مجبوری کی وجہ سے نہ زید ہندہ کو اپنی بیوی بنا کر ازدواجی زندگی گزارنا چاہتا ہے، اور نہ ان کے والدین، اس رشتہ سے راضی ہیں، ایسی صورتحال میں شرعی نقطہ نظر سے کیا حکم ہے؟ کیا دین مہر بھی ادا کرنا پڑے گا، اگر پڑے گا تو کتنا؟ اس کی صورت کیا ہوگی؟، ادا کرنے کی قرآن وحدیث اور فقہ حنفی کی مستند ومعتبر کتابوں کے حوالوں سے جواب مرحمت فرمائیں گے۔

جواب: الجواب حامداً ومصلیاً

زید اور ہندہ کے نکاح کے بعد اگر رخصتی نہیں ہوئی اور نہ ہی میاں بیوی کی تنہائی میں ملاقات ہوئی اور اب زید اس نکاح کو باقی نہیں رکھنا چاہتا اور دونوں کے والدین بھی اس رشتہ سے راضی نہیں ہیں تو ایسی صورت میں شریعت کے مطابق زید کو اختیار ہے کہ وہ ہندہ کو طلاق دے سکتا ہے۔

اگر زید طلاق دیتا ہے اور رخصتی یا خلوت صحیحہ (یعنی ایسی تنہائی جس میں مباشرت ممکن ہو) نہیں ہوئی ہے، تو زید پر پورا مہر واجب نہیں ہوتا بلکہ نصف مہر واجب ہوتا ہے، یعنی زید کو نصف مہر ادا کرنا پڑے گا۔

ادائیگی کی صورت یہ ہوگی کہ اگر مہر معین تھا، تو اس کا نصف زید کو ادا کرنا

ہوگا۔اوراگرمہر معین نہیں تھا،تو اس صورت میں متعہ دینا ہوگا۔

دلائل:

۱-قرآن کریم:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:" **وَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ**" (سورۃ البقرہ237)۔

ترجمہ: اوراگرتم ان کو اس حال میں طلاق دے دو کہ تم نے ان کو ہاتھ نہ لگایا ہو، حالانکہ ان کے لیے مہر مقرر کر چکے ہو تو اس مقررہ مہر کا نصف دینا ہوگا۔

۲- فقہ حنفی:

فقہ حنفی کی معتبر کتاب "بدائع الصنائع" میں بھی اس مسئلے کو اسی طرح بیان کیا گیا ہے:

"**وإن طلقها قبل الدخول وقد سمى لها مهرا فلها نصف المهر**" (بدائع الصنائع، کتاب النکاح)۔

نتیجہ:

لہٰذا، زید کو طلاق دینے کا اختیار ہے اور رخصتی یا خلوت صحیحہ نہ ہونے کی صورت میں نصف مہر ادا کرنا ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

جنون کی حالت میں دی گئی طلاق کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام مذکورہ مسئلہ کے بارے میں:
فہیم میرا بھانجہ ہے اور اس کا دماغی توازن درست نہیں ہے، اعظم گڈھ میں زیر علاج ہے، اسی جنون کی حالت میں فون پر بات کرتے ہوئے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ جنون کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ قرآن حدیث کی روشنی میں جواب دے کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

آج سے دو ماہ قبل فہیم احمد سے متعلق ہمارے دارالافتاء میں ایک استفتاء آیا تھا جس میں سوال کی نوعیت الگ تھی اور اس کے مطابق تین طلاق مغلظہ کے وقوع کا فتوی دیا گیا تھا، لیکن دوبارہ فہیم احمد سے متعلق جو سوال نامہ زیر تحریر ہے اس میں مکمل وضاحت نہیں ہے۔ مسئلہ شریعت کا ہے اور حلال وحرام کا ہے اس لئے صحیح صورت حال پیش کرنی چاہئے ورنہ کل قیامت میں پکڑ ہوگی، فقہاء نے مجنون کی دو قسمیں کی ہیں: ایک وہ جس کو کبھی کچھ ہوش وحواس نہ ہو، دوسرے وہ مجنون جس کو کچھ ہوش ہو، دونوں کا حکم الگ الگ ہے، اگر مجنون کو بالکل ہوش وحواس نہیں تو اس کی طلاق واقع نہیں ہوتی لیکن اگر کچھ ہوش ہو اور اسی ہوش کی حالت میں طلاق دی ہو تو طلاق واقع ہو جائے گی۔

عن قتادة قال الجنون جنونان فإن كان لايفيق لم يجز له طلاق

و إن کان یفیق فطلق فی حال افاقته لزمه ذلک (مصنف بن ابی شیبہ، کتاب الطلاق، مؤسسۃ علوم القرآن ۹/ ۵۴۹)۔

عن ابراهیم و غیر واحد من اصحابنا عن الشعبی، قال طلاق المجنون فی افاقته جائز و إذا طلق فی غیر افاقته لم یجز (سنن سعید بن منصور، کتاب الطلاق ۱/ ۳/ ۲۷۳، فتاوی قاسمیہ ۱۴/ ۳۷۰)۔

رجل عرف انه کان مجنونا فقالت له امرأته طلقت البارحة فقال اصابنی الجنون و لایعرف ذلک إلا بقوله کان القول قوله (شامی ۴/ ۴۵۱، کتاب النوازل ۹/ ۲۴۵)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

طلاق کو دل میں سوچنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام درج مسئلہ کے بارے میں:

زید نے اپنی بیوی سے کہا میں تم سے صحبت کرنا چاہتا ہوں اس کے بعد بیوی نے منع کر دیا یعنی صحبت کرنے سے، زید نے منع کرنے کے بعد اپنے دل میں سوچ لیا کہ اگر میں اس کے بعد تم سے صحبت کروں گا تو تم کو طلاق ہو جائے گی، صرف دل میں سوچا زبان سے ادا نہیں کیا، پھر سال یا چھ ماہ کے بعد بیوی نے صحبت کے لئے کہا تو زید نے کہا کہ میں نے اپنے دل میں سوچ

لیا ہے کہ اگر میں تم سے صحبت کروں گا تو تم کو طلاق ہو جائے گی، یعنی سال یا چھ ماہ کے بعد اس نے زبان سے ادا کر دیا تو کیا اس صورت میں اگر بیوی سے صحبت کرے گا تو طلاق ہوگی یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دے کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً و مصلیاً

بشرط صحت سوال مسئولہ صورت میں زید کی بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوئی، کیونکہ زید نے دل میں صرف طلاق کا خیال کیا تھا جس کا بعد میں حکایت کے طور پر زبان سے اظہار کیا ہے، یہاں زید کا مقصد زبان سے طلاق دینا نہیں ہے، **ولکن لابد ان یقصدھا باللفظ** (الاشباہ جدید زکریا ۹۱/۱)۔

لو اجریٰ الطلاق علی قلبہ وحرک لسانہ من غیر تلفظ یسمع لایقع (حاشیۃ الطحطاوی ۱۱۹)۔

فقد افاد ان رکنہ اللفظ الدال علی ازالۃ حل المحلیۃ (البحر الرائق ۲۵۲/۳)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم
مفتی حبیب اللہ قاسمی

”جاؤ تم کو طلاق دیدیا“ کہنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام مذکورہ مسئلہ کے بارے میں سلمہ

بانو بنت مرحوم محمد ادریس ساکنہ لال باغ فیض آباد میری شادی ہوئی تھی ۷؍اکتوبر ۲۰۱۵ء میں نفیس احمد ولد نصیر احمد ساکن صدر بازار لکھنؤ سے، آپس میں اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے لڑائی جھگڑا ہونے لگا جس کی وجہ سے طلاق کا معاملہ پیش آیا، شوہر نے کہا کہ جاؤ تم کو طلاق دے دیا، کئی بار کہا، ۲۰۱۶ میں اس نے طلاق دی اب سوال یہ ہے کہ عدت کے چند سال گزر گئے شوہر نے لکھ کر نہیں دیا مگر زبانی طلاق دے چکا ہے اور کئی بار دیا تو کیا اب دوسری شادی کر سکتی ہوں یا نہیں؟ شرعی فیصلہ کیا ہے، اور طلاق کے گواہ بھی موجود ہیں۔

الجواب حامداً ومصلياً

صورت مسئلہ میں شوہر کے کئی بار "جاؤ تم کو طلاق دے دیا" کہنے کی وجہ سے طلاق مغلظہ واقع ہوگئی، طلاق واقع ہونے کے لئے لکھ کر دینا ضروری نہیں محض زبان سے طلاق کہنے کی وجہ سے طلاق واقع ہو جاتی ہے، چونکہ طلاق کے کئی سال ہو گئے جس کی وجہ سے عدت پوری ہوگئی، لہٰذا عورت کو دوسرے شخص سے شادی کرنے کا شرعی حق حاصل ہے، نیز عورت کو شادی سے روکنے کا کسی بھی رشتہ دار کو کوئی حق نہیں ہے۔ متى كرر لفظ الطلاق بحرف الواو أوبغير حرف الواو يتعدد الطلاق

(عالمگیری، زکریا ۱؍۳۵۶)، (جدید زکریا ۱؍۴۲۳)۔ (قاضی خان علی ہامش الہندیۃ زکریا ۱؍۴۵۴)۔

عن ابن عباس أن النبي صلى الله عليه وسلم قال الأيم أحق بنفسها من وليها والبكر تستاذن في نفسها و اذنها صماتها و في رواية

قال الثیب أحق بنفسها من ولیها إلی آخره (مشکوۃ المصابیح باب الولی فی النکاح:۲۷۰)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

شوہر نے بیوی سے کہا میں تمہارے نکاح سے بری ہوں

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے یہ کہا کہ میں تمہارے نکاح سے بری ہوں تو کیا اس صورت میں اس کو خلع کہا جائے گا یا طلاق اگر طلاق کہا جائے گا تو کون سی طلاق واقع ہوگی؟ فقہ حنفی کی مستند و معتبر کتابوں کے حوالے سے جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً ومصلیاً

اگر شوہر اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ میں تمہارے نکاح سے بری ہوں تو اس جملے کا شرعی حکم نیت پر موقوف ہے۔ اگر اس نے طلاق کی نیت کی ہے تو یہ الفاظ طلاق کے کنایہ (غیر صریح) الفاظ میں شمار ہوتے ہیں اور اس صورت میں ایک طلاق بائن واقع ہوگی۔

اگر نیت خلع کی ہو تو اس کا خلع شمار کیا جائے گا، اور خلع کے بعد نکاح فوراً ختم ہو جاتا ہے، جس کے بعد رجوع کا حق نہیں ہوتا، لیکن اگر صرف الفاظ دیکھے جائیں اور کوئی نیت ظاہر نہ ہو تو یہ الفاظ عموماً طلاق کے کنایہ میں آتے ہیں اور طلاق واقع ہوگی۔

فقہ حنفی کی مستند کتاب ''بدائع الصنائع'' میں مذکور ہے۔

" وأما الكنايات فإن كانت من غير نية، لا يقع بها شیء، وإن كانت مع النية أو دلالة الحال فهي على ما نوى" (بدائع الصنائع، ج3، ص129)۔

اسی طرح ''فتاویٰ ہندیہ'' میں ہے:

" والكناية من غير نية لا يقع بها شیء، ومع النية يقع ما نواه"

(فتاویٰ ہندیہ، ج1، ص374)۔

لہٰذا اس مسئلے میں طلاق یا خلع کا حکم شوہر کی نیت پر منحصر ہے۔ اگر نیت طلاق کی تھی تو ایک طلاق بائن واقع ہوگی اور اگر نیت خلع کی تھی تو خلع واقع ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

حیض کی حالت میں طلاق دینے پر اس حیض کا شمار عدت میں ہوگا یا نہیں؟

سوال: ایک ادمی نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی تو اب سوال یہ ہے کہ وہ حیض جس میں طلاق دیا ہے اس کا شمار عدت میں ہوگا یا نہیں؟ مستند ومعتبر فقہ حنفی کی کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی تو وہ طلاق

شرعاً واقع ہو جائے گی، تاہم یہ طلاق گناہ کے ساتھ واقع ہوئی ہے کیونکہ طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ عورت کو پاکی کی حالت میں، جس میں ہمبستری نہ کی ہو، طلاق دی جائے۔

جہاں تک عدت کا تعلق ہے، تو حیض کی حالت میں دی گئی طلاق کا حیض عدت میں شمار نہیں ہوگا۔ عدت اس طلاق کے بعد آنے والے پہلے پاکی کے بعد والے حیض سے شروع ہوگی۔ حیض کے دوران دی گئی طلاق کے وقت کی حالت کو عدت میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

فقہ حنفی کی معتبر کتب میں اس کی تفصیل ملتی ہے، جیسا کہ درمختار میں ذکر ہے:

"ومن طلقها في الحيض لا تعتد بذلك الحيض، بل تستقبل العدة من الطهر بعده، لأن الطلاق إنما يقع في الطهر، ويستقبل العدة من حين وقوعه، لا من حين لفظه" (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الطلاق، باب العدۃ)۔

اسی طرح، عالمگیریہ میں بھی اسی مسئلہ کی وضاحت موجود ہے:

"ولو طلقها في الحيض لا تحتسب تلك الحيضة من عدتها، بل تستأنف عدتها بعد الطهر" (الفتاویٰ الہندیۃ، کتاب الطلاق، الباب الثانی فی العدۃ)۔

لہٰذا، حیض کے دوران دی گئی طلاق کے بعد آنے والے حیض سے عدت شروع ہوگی اور اسی کا شمار کیا جائے گا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

طلاق معلق کا حکم

سوال: میں نے اپنی عورت کو فون لگایا اور کہا دو مہینہ ہو گیا ہے میکے جا کر، گھر آنا ہے کہ نہیں؟ اس نے جواب دیا میں کہیں دوسری جگہ ہوں، میں نے پوچھا کون سی جگہ پر ہو؟ جگہ کا نام بتاؤ، تو اس نے کہا میں نہیں بتاؤں گی، میں نے کہا گھر رہنا ہے تو آؤ ورنہ اپنے ماں باپ کے ساتھ آؤ اور طلاق لے کر جاؤ۔ تو یہ کہنے سے طلاق ہو جاتی ہے کیا؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

صورت مسئولہ میں اگر آپ نے اپنی بیوی کو کہا کہ "گھر رہنا ہے تو آؤ ورنہ اپنے ماں باپ کے ساتھ آؤ اور طلاق لے کر جاؤ" تو یہ طلاق معلق کہلاتی ہے، جو کسی شرط کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ اگر آپ کا مقصد یہ تھا کہ وہ گھر آ جائے ورنہ طلاق ہو جائے گی، تو اس صورت میں شرط پوری ہونے پر طلاق واقع ہو جائے گی۔

فقہ حنفی کی مستند کتاب "فتاویٰ عالمگیری" میں اس طرح کے معاملات کا ذکر موجود ہے:

"ومن علق الطلاق بشرط، إن وجد الشرط وقع الطلاق"

(فتاویٰ عالمگیری، کتاب الطلاق، جلد ا، صفحہ ۳۷۳، مکتبہ طیبہ دیوبند انڈیا و دار الاشاعت کراچی)

لہٰذا اگر آپ کی بیوی آپ کی شرط پوری نہ کرے، یعنی گھر نہ آئے، تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ تاہم، اگر آپ کا مقصد طلاق دینا نہیں تھا، بلکہ صرف تنبیہ تھی تو اس

کی نیت کے اعتبار سے فیصلہ کیا جائے گا۔

احتیاطاً اس قسم کے کلمات استعمال کرنے سے گریز کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے طلاق کے واقع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

تین طلاق دینے کے بعد کیا حکم ہے؟

سوال: اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا ایک جاننے والے بھائی ہیں ان کی شادی ہوئی میرے خیال میں چھ سال ہو چکے ھیں اور ابھی ایک بچہ بھی ہوا تھا جس کی عمر تین مہینے تھی اور بھائی جو ہے وہ کسی اور عورت کے چکر میں ائے ہوئے ہیں، اور انہوں نے اپنی جو موجودہ بیوی ہے اس کے گھر میں ائے اور اس نے تین طلاقیں دی ہیں اس کو ایک ہی دن میں دروازہ کھول کے گھر میں داخل ہوا داخل ہو کے اور اس کو اس نے تین دفعہ بولا کہ میں تم کو طلاق دیتا ہوں طلاق دیتا ہوں طلاق دیتا ہوں۔ پھر اس کے بعد وہ گھر سے چلا گیا اب تب سے لے کے ابھی تک وہ گھر میں واپس نہیں گیا اور نہ ہی اس نے کوئی بیوی کے ساتھ رابطہ کیا اور نہ ہی بچے کے ساتھ۔

اب پوچھنا یہ تھا کہ کیا اس کی طلاق ہو چکی ہے؟ جب اس نے مجھ سے بات کی تو میں نے کہا کیونکہ تمہارا بچہ ہے ابھی تین مہینے کا ہے اب مجھے ان

چیزوں کے بارے میں ڈیٹیل معلومات نہیں ہیں کہ اپ کی طلاق واقع ہو چکی ہے یا نہیں؟ یہ میں مفتی صاحب سے پوچھ کے ان کو بتا کے پھر وہ مجھے جو جواب دیں گے میں اس کے مطابق اپ کو بتاؤں گا۔تو اپ پلیز یہ کلیئر کر دیں کہ اس بندے نے اگر ایک دن میں ایک وقت میں تین دفعہ بول دیا کہ طلاق ہے طلاق ہے طلاق ہے یا دیتا ہوں کہا آیا وہ طلاق ہو چکی ہے یانھیں؟ ابھی کیا پروسیجر ہے اس کا اگے اس نے کیا کرنا ہے؟ اگر انہوں نے واپس اکٹھے ہونا ہے تو کیا ہو سکتے ہیں یا نہیں ہو سکتے ؟ یا اس کا کوئی اور پروسیجر ہے وہ مجھے پلیز بتا دیجیے۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی کے مطابق اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دی ہیں، یعنی ایک ہی وقت میں ''طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں'' کہا ہے، تو یہ تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی، اور اس کے بعد بیوی اس شخص پر بالکل حرام ہو جائے گی۔ اب ان دونوں کا نکاح بالکل ختم ہو چکا ہے اور بغیر حلالہ شرعی کے دوبارہ ان کا نکاح ممکن نہیں ہے۔

اس مسئلہ کی تفصیل میں 'الدر المختار' (جلد 3، صفحہ 242) میں واضح طور پر ذکر ہے:

"إذا قال لامرأته: أنت طالق ثلاثا في مجلس واحد، وقعن جميعا"۔

یعنی اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دیں، تو تینوں واقع ہو جائیں گی۔

'فتاویٰ عالمگیری' (جلد 1، صفحہ 374) میں بھی یہ حکم مذکور ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاقیں دینا ایک مؤثر عمل ہے اور اس سے طلاق مغلظہ واقع ہو جاتی ہے۔

اب چونکہ اس شخص نے تین طلاقیں دے دی ہیں، تو ان کے دوبارہ اکٹھے ہونے کا واحد طریقہ حلالہ شرعی ہے، یعنی عورت کا عدت کے بعد کسی دوسرے شخص سے نکاح ہو، اس کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم ہو اور پھر اگر وہ دوسرا شوہر اسے طلاق دے دے یا اس کا انتقال ہو جائے، تب وہ عدت گزار کر پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے۔ اس کے بغیر وہ دونوں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

اس کے علاوہ اگر شوہر نے بیوی کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں کیا اور اس کا حال بھی نہیں پوچھا، تو اس کے بعد شوہر کا بیوی پر کوئی حق باقی نہیں رہا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

دو طلاق کے بعد ایک طلاق اور دیدیا اس کا کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام ایک شوہر نے اپنی بیوی کو دو طلاق دیا اور اس کے بعد اس نے رجوع کر لیا رجوع کرنے کے بعد پھر ایک طلاق دیا تو اس صورت میں کیا حکم ہے قرآن حدیث اور فقہ حنفی کی روشنی میں حوالے کے ساتھ اس کا جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

شریعت مطہرہ کی روشنی میں طلاق دینے کا مسئلہ بہت ہی حساس اور اہمیت کا حامل ہے۔آپ کے سوال میں جس صورت کا ذکر کیا گیا ہے،اس کو تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

قرآن مجید کی روشنی میں:

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

"**اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمۡسَاکٌ بِمَعۡرُوفٍ أَوۡ تَسۡرِيحٌ بِإِحۡسَانٍ**" (سورۃ البقرہ:229)۔

ترجمہ:"طلاق دو بار ہے،اس کے بعد یا تو بھلے طریقے سے روک لینا ہے یا اچھی طرح چھوڑ دینا ہے"۔

مسئلہ کی وضاحت:

ا- جب شوہر نے پہلی مرتبہ دو طلاقیں دی،تو بیوی پر دو طلاق واقع ہو گئیں اور اس کے بعد شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہا۔

۲-شوہر نے اگر عدت کے دوران رجوع کر لیا تو نکاح برقرار رہا۔

۳-رجوع کے بعد شوہر نے جب ایک طلاق دی،تو کل ملا کر تین طلاقیں ہو چکی ہیں (دو پہلے اور ایک بعد میں)۔

۴-چونکہ مجموعی طور پر تین طلاقیں مکمل ہو گئی ہیں،لہٰذا اب بیوی شوہر پر حرام ہو گئی ہے اور رجوع کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔

فقہ حنفی کی روشنی میں:

فقہ حنفی کے مطابق جب تین طلاقیں واقع ہو جائیں، تو اس کے بعد رجوع یا دوبارہ نکاح کی گنجائش نہیں رہتی، جب تک کہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے اور وہ دوسرا شوہر یا تو فوت ہو جائے یا اپنی مرضی سے طلاق دے دے، اس کے بعد وہ پہلے شوہر کے لیے حلال ہو سکتی ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''الدر المختار'' میں ہے:

''إذا طلقها ثلاثًا بانت منه وحرمت عليه حتى تنكح زوجًا غيره'' (الدر المختار، جلد 2، صفحہ 765)۔

ترجمہ: ''جب شوہر اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دے تو وہ اس سے جدا ہو جاتی ہے اور اس پر حرام ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ کسی اور مرد سے نکاح کرے''۔

لہٰذا، آپ کے سوال کی صورت میں تین طلاقیں واقع ہو چکی ہیں، اور اب بیوی شوہر پر حرام ہو چکی ہے۔ اب دوبارہ نکاح کی گنجائش نہیں، جب تک کہ شرعی حلالہ نہ ہو۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿باب الخلع﴾

مال کے عوض میں طلاق کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شوہر نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں تم کو 50000 ہزار روپے کے بدلے میں طلاق دیتا ہوں، اسی مجلس میں عورت نے اس کو قبول کرلیا، تو اب سوال یہ ہے اس سے کون سی طلاق واقع ہوگی اور کیا وہ 50 ہزار روپیہ بیوی کے لیے دینا ضروری ہے اور شوہر کے لیے لینا جائز ہے۔

جواب: الجواب حامداً ومصلیا

اگر شوہر نے اپنی بیوی کو کہا کہ میں تمہیں پچاس ہزار روپے کے بدلے میں طلاق دیتا ہوں اور بیوی نے اسی مجلس میں اس کو قبول کرلیا تو یہ طلاق خلع کے زمرے میں آتی ہے۔ خلع ایک ایسی طلاق ہے جو بیوی کی طرف سے معاوضہ کے بدلے میں لی جاتی ہے۔ اس صورت میں خلع واقع ہو جائے گا، اور شوہر کے لیے پچاس ہزار روپے لینا جائز ہوگا اور بیوی کے لیے دینا واجب ہوگا۔

خلع کے بارے میں فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں واضح احکامات موجود ہیں:

۱-بدائع الصنائع میں ہے:

"وإذا خالع الرجل امرأته على مال صح الخلع" (بدائع الصنائع، کتاب الطلاق، جلد۳، صفحہ:۱۰۰)۔

۲-بحرالرائق میں ہے:

"والخلع صحيح بمقابل مال، سواء كان ذلك المال قليلا أو كثيرا" (بحرالرائق، کتاب الطلاق جلد۴، صفحہ۱۴۱)۔

۳-فتح القدیر میں ہے:

"الخلع جائز بين الزوجين بمال يتراضيان عليه" (فتح القدیر، کتاب الطلاق، جلد۳، صفحہ۳۶۲)۔

ان حوالوں سے واضح ہے کہ خلع کے معاملے میں مال کا لین دین درست ہے اور طلاق واقع ہو جائے گی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

خلع کس طلاق کے حکم میں ہے

سوال: خلع کس طلاق کے حکم میں ہے۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

جب شوہر نے بیوی کو پچاس ہزار روپے کے بدلے میں طلاق دی اور بیوی

نے اس کو قبول کرلیا، تو اس سے طلاق بائن واقع ہوگی، طلاق بائن وہ طلاق ہے جس سے نکاح فوری طور پر ختم ہو جاتا ہے، اور شوہر اور بیوی کے درمیان دوبارہ نکاح کیے بغیر رشتہ بحال نہیں ہوسکتا۔ خلع کی صورت میں یہی طلاق بائن واقع ہوتی ہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں طلاق بائن کے بارے میں احکام موجود ہیں:

۱- بدائع الصنائع میں ہے:

"**والخلع طلاق بائن بالإجماع**" (بدائع الصنائع، کتاب الطلاق، جلد ۳، صفحہ: ۱۰۰)۔

۲- بحر الرائق میں ہے:

" **الخلع يكون طلاقا بائنا بمجرد الاتفاق على العوض**" (بحر الرائق، کتاب الطلاق، جلد ۴، صفحہ ۱۴۱)۔

۳- فتح القدیر میں ہے:

"**الخلع طلاق بائن، لا يملكه الزوج بعد ذلك إلا بعقد جديد**" (فتح القدیر، کتاب الطلاق، جلد ۳، صفحہ: ۳۶۲)۔

ان حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خلع کی صورت میں طلاق بائن واقع ہوتی ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

عوض کے بدلے طلاق کا حکم

سوال: ایک شوہر نے اپنی بیوی سے تنگ آ کر یہ کہا کہ تم اپنے کو ایک لاکھ روپے

کے بدلے طلاق دے لو لیکن اس نے ایک یا دو یا تین طلاق کی صراحت نہیں
کی تو صورت میں بیوی اپنے اوپر کتنی طلاق واقع کر سکتی ہے کیا اس میں شوہر
کی نیت کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟ فقہ حنفی کی مستند و معتبر کتابوں کے حوالے سے
اس کا جواب چاہیے۔

الجواب حامداً ومصلیاً

خلع کے معاملے میں اگر شوہر عوض (بدل) کے ساتھ طلاق دیتا ہے لیکن طلاق کی تعداد کی صراحت نہیں کرتا، جیسے آپ کے سوال میں ذکر ہوا کہ شوہر نے کہا تم اپنے کو ایک لاکھ روپے کے بدلے طلاق دے لو، لیکن ایک دو یا تین طلاق کا ذکر نہیں کیا، تو اس صورت میں فقہ حنفی کے اصول کے مطابق ایک طلاق بائن واقع ہوگی کیونکہ جب طلاق کی تعداد واضح نہ ہو اور نیت بھی معلوم نہ ہو، تو اصل یہی ہے کہ کم سے کم ایک طلاق بائن واقع ہوگی۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب فتاویٰ ہندیہ میں اس مسئلے کی وضاحت موجود ہے: "**إذا قال لها: خالعتک علی ألف درهم ولم يذكر عدد الطلاق، تقع طلقة بائنة**" (فتاویٰ ہندیہ، ج 1، ص 384)۔

اسی طرح درمختار میں بھی ذکر ہے "**ولو خالعها ولم يذكر عدد الطلاق يقع واحدة بائنة**" (درمختار مع ردالمحتار، ج 3، ص 500)۔

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر طلاق کی تعداد کی صراحت نہ کی جائے تو نیت کے بغیر ایک ہی طلاق بائن واقع ہوگی۔ البتہ اگر شوہر کی نیت میں ایک سے

زیادہ طلاق تھی تو اس کی نیت کا اعتبار کیا جائے گا، جیسا کہ فقہ حنفی میں نیت کو کنایہ الفاظ کے ساتھ معتبر مانا جاتا ہے۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

بدل خلع خنزیر کو بنانے کا حکم

سوال: ایک عورت نے اپنے شوہر سے خلع کی درخواست کی لیکن بدل خلع اس نے خنزیر کو بنایا اور شوہر نے خلع کو منظور کرلیا اب سوال یہ ہے کیا اس صورت میں خلع صحیح ہوگا یا نہیں؟ اور اس صورت میں کون سی طلاق واقع ہوگی؟ اور عورت بدل خلع میں خنزیر دے سکتی ہے یا نہیں؟ جب کہ دونوں مسلمان ہیں فقہ حنفی کی مستند ومعتبر کتاب کے حوالے سے جواب بتلائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً

خلع کے معاملے میں بدل (عوض) کا شرعی حیثیت سے جائز ہونا ضروری ہے۔ اگر بدل خلع کوئی ایسی چیز ہو جو شرعاً حرام یا ناپاک ہے، جیسے خنزیر یا شراب، تو اس کا بدل بنانا جائز نہیں ہے۔ آپ کے سوال کے مطابق اگر عورت نے بدل خلع میں خنزیر پیش کیا اور شوہر نے اس کو قبول کرلیا، تو اس صورت میں خلع تو واقع ہو جائے گا، لیکن خنزیر جیسی حرام چیز کو بدل بنانا صحیح نہیں ہے۔ ایسی صورت میں شرعاً عورت پر کسی اور جائز مال کا بدل واجب ہوگا۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب درمختار میں اس مسئلے کی وضاحت موجود ہے:

"لو خالعها علی خمر أو خنزیر یقع الطلاق، ولا یستحق بدلا لأن الخمر والخنزیر لیسا مالا متقوما فی حق المسلم" (درمختار مع ردالمختار، ج 3، ص500)۔

اسی طرح فتاویٰ ہندیہ میں بھی اس مسئلے کی تصریح ہے:

"لو خالعها علی خمر أو خنزیر یقع الطلاق بائنا ولا شیء لها" (فتاویٰ ہندیہ، ج1، ص385)۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ اگر بدل خلع میں خنزیر یا کوئی اور حرام چیز رکھی جائے تو خلع تو واقع ہو جائے گا اور ایک طلاق بائن واقع ہوگی، لیکن اس حرام چیز کا بدل شمار نہیں ہوگا اور عورت پر لازم ہوگا کہ وہ کوئی اور جائز بدل ادا کرے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

خلع کی ایک نادر صورت

سوال: ایک شخص اپنی بیوی سے ناچاقی کی وجہ سے خلع چاہتا تھا بیوی نے کہا میرے ہاتھ میں جو کچھ ہے اس کے عوض میں مجھے گلوخلاصی دے دو شوہر نے اس کو منظور کرلیا بیوی نے جب ہاتھ کھولا تو اس کا ہاتھ خالی تھا اب سوال یہ ہے کہ اس صورت میں خلع ہوگا یا نہیں؟ اور بیوی کو اس کے بدلے میں کچھ دینا ہوگا

یا نہیں؟ فقہ حنفی کی مستند اور معتبر کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً

خلع کے معاملے میں جب بیوی کوئی عوض مال یا رقم دے کر شوہر سے اپنے آپ کو آزاد کرانا چاہتی ہے اور شوہر اس پر راضی ہو جاتا ہے، تو خلع کا معاہدہ اسی عوض پر موقوف ہوتا ہے۔ آپ کے سوال کے مطابق بیوی نے کہا کہ میرے ہاتھ میں جو کچھ ہے اس کے عوض مجھے خلع دے دو اور جب ہاتھ کھولا تو ہاتھ خالی تھا، اس صورت میں چونکہ معاہدہ کسی موجود عوض پر نہیں ہوا اور نہ ہی کچھ دیا گیا، اس لیے شرعاً یہ خلع درست نہیں ہوگا۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب بدائع الصنائع میں اس حوالے سے ذکر ہے:

"إذا كان الخلع على مال ولم يكن ثمة مال، لا يلزم المال ويقع الطلاق" (بدائع الصنائع، ج3، ص125)۔

اسی طرح فتاوی عالمگیری فتاویٰ ہندیہ) میں ہے: **"ولو خالعها على ما في يدها، ولم يكن في يدها شيء، وقع الطلاق ولا شيء عليها"** (فتاویٰ ہندیہ، ج1، ص385)۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ اگر عوض موجود نہ ہو تو خلع کا معاہدہ باطل ہو جاتا ہے، البتہ شوہر کی جانب سے ایک طلاق بائن واقع ہو جائے گی، اور بیوی پر کسی عوض کی ادائیگی لازم نہیں ہوگی، کیونکہ خلع کا معاہدہ جس شرط پر ہوا تھا، وہ پوری نہیں ہوئی۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

خلع کا طریقہ

سوال: کیا فرماتے ہیں حضرات مفتیان کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں میاں بیوی کے درمیان ایک عرصہ سے تعلقات ختم تھے دونوں نے مل کر اس کو دور کرنا چاہا لیکن بات نہ بنی، پھر خاندانی سطح پر بات چیت ہوئی لیکن پھر بھی بیوی اس شوہر کو بالکل قبول کرنا نہیں چاہتی ہے، اب ایسی صورتحال کے پیش نظر شوہر اپنی بیوی سے خلع کے ذریعہ نکاح ختم کرنا چاہتا ہے اسلامی طریقہ کے مطابق کیا طریقہ ہے؟ جدائی سے پہلے آپس میں کچھ ہدیہ دے کر خوشی خوشی جدا ہونا ہوگا ہوگا؟ یا کیا طریقہ ہے براہ کرم رہبری فرمائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

خلع ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے شوہر اور بیوی کے درمیان نکاح کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے جب بیوی شوہر کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو اور حالات بھی ایسے ہو جائیں کہ ساتھ رہنا ممکن نہ رہے۔ خلع کے لیے ضروری ہے کہ شوہر اور بیوی باہمی رضامندی سے اس معاہدے کو طے کریں۔

فقہ حنفی کے مطابق خلع کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ بیوی شوہر کو کچھ مال یا مہر واپس کر دے، اور شوہر اس کے عوض بیوی سے علیحدگی اختیار کرے۔ خلع کے بعد دونوں کے درمیان ازدواجی تعلقات ختم ہو جاتے ہیں، اور بیوی عدت گزارنے کے بعد آزاد ہو جاتی ہے۔

شرعی طریقہ:

۱-معاہدۂ خلع:

شوہراور بیوی دونوں کے درمیان باہمی رضامندی سے خلع کا معاہدہ ہو جس میں شوہراپنی بیوی کوخلع کے عوض کچھ دے دے، یا بیوی شوہرکو کچھ مال وغیرہ دے۔

۲-خلع کے الفاظ:

شوہرخلع کے الفاظ کہے جیسے کہ ''میں نے خلع قبول کیا''،اس طرح خلع واقع ہوجائے گا۔ یہ الفاظ دونوں کے درمیان علحدگی کا باعث بنتے ہیں۔

۳-عدت:

خلع کے بعد بیوی پر عدت گزارنا واجب ہوگا، جو تین حیض کی مدت ہے اگر وہ حیض والی ہے۔اگر حمل سے ہوتو عدت وضع حمل ہوگی۔

۴-ہدیہ:

اگر دونوں رضا مندی سے خوشی خوشی ایک دوسرے کو کچھ ہدیہ دے کر جدا ہوں تو یہ بہتر ہے، لیکن شرعاً اس کی پابندی نہیں ہے، بلکہ یہ باہمی اخلاقی طرزعمل پر منحصر ہے۔

دلائل اور حوالہ جات:

خلع کے بارے میں فقہ حنفی میں متعدد حوالے موجود ہیں۔ بدائع الصنائع میں ہے:

”الخلع يقع بلفظ الطلاق وغيره كالخلع والفداء والنزع والبرائة والإبراح ونحوها، حتى لو قالت له: خالعني بكذا أو طلقني على كذا فقال: فعلت أو اخترت وقع الطلاق وإن لم يقل: خالعت أو طلقت“ (بدائع الصنائع، کتاب الطلاق، جلد 3، صفحہ 163)H

اسی طرح درمختار میں ہے:

”إذا قال خالعتک بألف فقالت قبلت وقع الطلاق بعوض، وإن لم يقل خالعتُ ولا طلقت لأنه صريح في الفداء“ (درمختار، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 629)۔

ان حوالہ جات سے واضح ہے کہ خلع کے لیے شوہر اور بیوی کے درمیان باہمی رضامندی ضروری ہے، اور اس کے عوض بیوی کچھ مال دیتی ہے۔ خلع کے بعد شوہر و بیوی کا نکاح ختم ہو جاتا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿باب الایلاء﴾

ایلاء کو ختم کرنے کے لئے شوہر جماع پر قادر نہیں ہے، اس کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے ایلا کیا لیکن وہ جماع پر قادر نہیں ہے، ایسی صورت میں اس کا کیا حکم ہے اس کا ایلا کیسے ختم ہوگا۔ فقہ حنفی کی معتبر و مستند کتابوں کے حوالے سے اس کو بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

ایلا کا حکم:

ایلا کے تحت اگر شوہر چار مہینے یا اس سے زیادہ مدت کے لئے قسم کھائے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ جماع نہیں کرے گا، تو چار مہینے کی مدت پوری ہونے کے بعد اسے یا تو بیوی کو طلاق دینی ہوگی یا پھر قسم توڑ کر جماع کرنا ہوگا۔

صورت مسئلہ:

اگر شوہر جسمانی طور پر جماع پر قادر نہیں ہے (یعنی وہ نامرد ہے) تو ایلا کے

احکام اس پر لاگو نہیں ہوں گے۔ فقہ حنفی کے مطابق ایلا کے احکام اس صورت میں ہوتے ہیں جب شوہر کے پاس جماع کی قدرت ہو۔ اگر شوہر جماع پر قادر نہیں ہے تو ایلا کی قسم اور اس کے احکام اس پر لاگو نہیں ہوں گے۔

حوالہ جات:

۱-الدر المختار مع رد المحتار (ابن عابدین شامی)، جلد۳، صفحہ۳۹۵

"**وفي معنى الإيلا: أن يحلف لايطاها أربعة أشهر أو أكثر، فإن حلف على أقل من ذلك فليس بإيلاء**"۔

ترجمہ: ایلا کی تعریف میں یہ ہے کہ شوہر قسم کھائے کہ وہ چار مہینے یا اس سے زیادہ مدت تک اپنی بیوی کے ساتھ جماع نہیں کرے گا، اگر اس سے کم مدت کے لئے قسم کھائے تو اسے ایلا نہیں کہا جائے گا۔

۲-البحر الرائق شرح کنز الدقائق (ابن نجیم الحنفی)، جلد۳، صفحہ۲۴۱

"**إن كان غير قادر على الوطئ اصلاً فلا يصح إيلاؤه**"۔

ترجمہ: (اگر کوئی شخص جماع کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اس کا ایلا صحیح نہیں ہوگا)۔

حکم:

ایسی صورت میں چونکہ شوہر جماع پر قادر نہیں ہے، لہٰذا اس کا ایلا شرعی طور پر صحیح نہیں ہوگا، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایلا کی شرعی مدت ختم ہونے کے بعد بھی طلاق

لازم نہیں ہوگی اور نہ ہی قسم کا کفارہ دینا ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

ایلاء کی تعریف اور احکام

سوال: ایلا کے کیا احکامات ہیں؟ اس کی کیا تفصیلات ہیں؟ مستند و معتبر کتاب کے حوالے کے ساتھ بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

ایلا:

اسلامی شریعت میں ایلا اس وقت ہوتا ہے جب شوہر قسم کھاتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایک مخصوص مدت تک جماع نہیں کرے گا، اس قسم کو ''ایلا'' کہا جاتا ہے، اور اس کا حکم قرآن کریم میں سورہ البقرہ میں آیا ہے۔

ایلا کے احکام:

۱۔مدت: ایلا کی کم سے کم مدت چار مہینے ہیں، اگر شوہر چار مہینے یا اس سے زیادہ کی مدت کے لئے قسم کھاتا ہے تو اس مدت کے بعد بیوی کو طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔

۲۔رجوع: اگر شوہر چار مہینے کی مدت پوری ہونے سے پہلے رجوع کرتا ہے اور قسم توڑتا ہے تو اس پر کفارہ لازم ہوتا ہے۔

مستند کتب کے حوالہ جات:

۱-قرآن کریم:

سورۃ البقرہ، آیت:۲۲۶، ۲۲۷:

"للذين يؤلون من نسائهم تربص أربعة أشهر فإن فاؤوا فإن الله غفور رحيم" (۲۲۶) و إن عزموا الطلاق فإن الله سميع عليم (۲۲۷)۔

ترجمہ: (وہ لوگ جو اپنی بیویوں سے قسم کھاتے ہیں (کہ ان کے قریب نہیں جائیں گے)، ان کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اگر وہ رجوع کرلیں تو اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اور اگر انہوں نے طلاق کا ارادہ کرلیا ہو تو اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۲-الدر المختار مع رد المحتار (ابن عابدین شامی)، جلد۳، ص ۳۹۵:

یہاں ایلا کے مسائل اور اس کے متعلق شرعی احکام تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

۳-فتح القدیر (ابن ہمام)، جلد۴، صفحہ ۳۲۴:

اس کتاب میں ایلا کے شرعی احکام، قسم کی خلاف ورزی کی صورت میں کفارہ اور رجوع کی صورت میں لازم آنے والے احکام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کفارہ:

اگر شوہر ایلا کی مدت کے دوران رجوع کرتا ہے تو اسے کفارہ ادا کرنا ہوتا

ہے، جو کہ قسم توڑنے کا کفارہ ہوتا ہے۔ اس میں ایک غلام آزاد کرنا یا دس مسکینوں کو کھانا کھلانا، یا دس مسکینوں کو کپڑے دینا شامل ہے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھنے کا حکم ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

دو مہینے تک بیوی سے دور رہنے کی قسم کا حکم

سوال: ایک شخص نے اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے قسم کھائی کہ "میں دو مہینے تک تمہارے قریب نہیں جاؤں گا"۔ کیا یہ ایلا کہلائے گا یا نہیں؟ اور اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ فقہ حنفی کی معتبر کتابوں کے حوالہ جات کے ساتھ جواب دیں۔

جواب:

ایلا کی تعریف:

ایلا ایسی قسم کو کہتے ہیں جس میں شوہر اپنی بیوی کے ساتھ چار مہینے یا اس سے زیادہ مدت کے لئے جماع نہ کرنے کا عزم کرتا ہے۔

مسئلہ کی وضاحت:

اس مسئلے میں جو قسم کھائی گئی ہے، وہ دو مہینے کی مدت کے لئے ہے۔ فقہ حنفی کے مطابق، ایلا کی کم سے کم مدت چار مہینے ہوتی ہے۔ اگر مدت چار مہینے سے کم ہو تو

اسے شرعی اصطلاح میں ایلا نہیں کہا جائے گا۔ لہٰذا اس صورت میں قسم کھانے والے شخص کا عمل ایلا کے دائرے میں نہیں آتا ہے۔

حوالہ جات:

۱- الدر المختار مع رد المحتار (ابن عابدین شامی)، جلد ۳، صفحہ ۳۹۵

"وفي معنى الإيلاء: أن يحلف لا يطاها أربعة أشهر أو أكثر، فإن حلف على أقل من ذلك فليس بإيلاء"۔

ترجمہ: (ایلا کی تعریف میں یہ ہے کہ شوہر قسم کھائے کہ وہ چار مہینے یا اس سے زیادہ مدت تک اپنی بیوی کے ساتھ جماع نہیں کرے گا۔ اگر اس سے کم مدت کے لئے قسم کھائے تو اسے ایلا نہیں کہا جائے گا۔

۲- الفقہ الاسلامی وأدلتہ (وہبہ الزحیلی)، جلد ۷، صفحہ ۵۵۰:

اس کتاب میں بھی ایلا کی تعریف اور اس کی کم سے کم مدت کی وضاحت کی گئی ہے۔

حکم:

چونکہ یہاں قسم کی مدت چار مہینے سے کم ہے، اس لیے یہ ایلا نہیں کہلائے گا، البتہ اس قسم کی خلاف ورزی کی صورت میں کفارہ واجب ہوگا، جیسا کہ قسم توڑنے کی صورت میں ہوتا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿باب الظهار﴾

ظہار صرف بیوی سے ہوسکتا ہے یا کسی اور سے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ظہار صرف بیوی ہی سے ہوتا ہے یا کسی اور سے بھی ہوسکتا ہے، مستند و معتبر حنفی کی کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

ظہار ایک شرعی مسئلہ ہے جو خاص طور پر بیوی کے ساتھ متعلق ہے۔ فقہ حنفی کے مطابق، ظہار صرف اور صرف بیوی ہی سے ہوسکتا ہے، کسی اور سے نہیں۔ یعنی اگر شوہر اپنی بیوی کو ماں یا کسی اور محرم عورت کے جسم کے کسی حصے سے تشبیہ دے، تو اس سے ظہار ثابت ہوتا ہے۔ دوسری عورتیں، مثلاً، بہن، پھوپھی خالہ وغیرہ، ان سے ظہار نہیں ہوسکتا، کیونکہ ان سے نکاح حرام ہے اور ان کے ساتھ نکاح کا تصور ہی نہیں، لہٰذا ان کے متعلق ظہار کا مسئلہ نہیں ہوگا۔

حوالہ جات:

۱۔(الدر المختار مع رد المحتار، جلد 3، صفحہ 430)۔

”وَالشَّرْطُ أَنْ يَكُونَ الْمَشْبُوهُ بِهَا زَوْجَةً لَهُ، لأَنَّهُ لا يَتَحَقَّقُ الظِّهَارُ إِلَّا فِي الزَّوْجَةِ“۔

۲-(فتاوی عالمگیری، جلد2، صفحہ 560)۔

”الظِّهَارُ لا يَكُونُ إِلَّا فِي الْمَرْأَةِ الزَّوْجَةِ، وَإِنْ قَالَ ذَلِكَ لِغَيْرِهَا، لَا يَكُونُ ظِهَارًا“۔

۳-(البحر الرائق، جلد4، صفحہ 52)

”إِذَا قَالَ ذَلِكَ لِغَيْرِ زَوْجَتِهِ، لَا يَكُونُ ظِهَارًا ، لِأَنَّ الظِّهَارَ خَاصٌّ بِالزَّوْجَةِ“۔

ان حوالہ جات سے واضح ہے کہ ظہار کا حکم صرف بیوی کے ساتھ مخصوص ہے، اور کسی اور عورت کے ساتھ ظہار کا تصور نہیں ہے۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

شوہر نے بیوی سے کہا تمہارا پیٹ میری ماں کے پیٹ کی طرح ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے میں کسی شخص نے اپنی بیوی سے کہا تمہارا پیٹ میری ماں کے پیٹ کی طرح ہے تو اس کا کیا حکم ہے،

تفصیلی حوالہ چاہئے۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

آپ نے جو حوالہ جات کی تفصیل مانگی ہے، تو یہاں فقہ حنفی کی ان معتبر کتابوں کی عبارتیں درج کی جارہی ہیں جو اس مسئلے سے متعلق ہیں۔

۱-(الدر المختار مع ردالمحتار جلد 3، صفحہ 434):

"وَقَدْ صَرَّحُوا بِأَنَّ الظهار لا يَكُونُ إِلَّا بالتشبيه بالظهر أَوْ غَيْرِهِ مِنْ جَوَانِبِ الْأُمِّ أَوْ غَيْرِهَا، وَإِذَا كَانَتْ الْعِبَارَةُ لَا تَتَضَمَّنُ هَذَا الْمَعْنَى لَايَكُونُ ظِهَارًا"۔

۲-(البحر الرائق .2 * جلد 4 صفحہ 45):

"إِذَا قَالَ لَهَا: أَنْتِ عَلَيَّ كَظهر أمي، أَوْ كَبَطْنِها، أَوْ كَمَا تَشْتَهي، فَفِي جَمِيعِ ذَلِكَ يَكُونُ ظِهَارًا، وَإِذَا كَانَ التَّشْبِيه غَيْرَ صَرِيحٍ أَوْ بِلَفْظٍ لَا يَدُلُّ عَلَى التَّحْرِيمِ، فَلَا يَكُونُ ظِهَارًا"۔

۳-(فتاوی شامی (ردالمحتار)، جلد 3، صفحہ 434):

"إِنَّ الظِّهَارَ هُوَ التَّشْبِيهُ بِالظَّهْرِ أَوْ بِسَائِرِ أَعْضَاءِ الْأُمِّ عَلَى وَجْهِ التَّحْرِيمِ، فَإِذَا كَانَ التَّشْبِيهُ لَا يُفِيدُ ذَلِكَ لَا يَكُونُ ظِهَارًا"۔

ان حوالہ جات سے واضح ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایسے الفاظ کہتا ہے جن میں ماں سے تشبیہ تو ہے، لیکن وہ تشبیہ ظہار کے معنی میں نہ ہو، جیسے پیٹ یا دیگر اعضا کا ذکر

بغیر حرمت کی نیت کے، تو اس سے ظہار ثابت نہیں ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

ظہار کے بعد دو ماہ کے بجائے چار ماہ کا روزہ رکھا؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں ایک شخص نے اپنی بیوی سے ظہار کیا اس کے بعد اس نے مسلسل چار مہینے کا روزہ رکھا تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا اس سے اس کا کفارہ ادا ہو جائے گا یا نہیں؟ فقہ حنفی کی مستند و معتبر کتابوں کے حوالے سے اس کا جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے ظہار کیا اور پھر اس نے کفارے کے طور پر مسلسل چار مہینے کا روزہ رکھا، تو اس سے اس کا کفارہ ادا ہو جائے گا۔ فقہ حنفی کے مطابق ظہار کا کفارہ یہ ہے کہ مسلسل دو مہینے 60 دن کے روزے رکھے جائیں۔ اس تسلسل میں کوئی ناغہ یا وقفہ نہیں ہونا چاہیے، سوائے کسی شرعی عذر کے۔

لٰہذا، مذکورہ صورت میں چار مہینے کا روزہ رکھنے سے کفارہ ادا ہو جائے گا، کیونکہ شریعت نے کفارے کے لیے دو مہینے کے مسلسل روزے کی قید لگائی ہے، جو پوری ہو چکی ہے۔

حوالہ جات:

۱-(الدر المختار مع رد المحتار، جلد 3، صفحہ 451)

”وَشَرْطُهُ التَّتَابُعُ فِي الصِيَامِ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ، فَإِذَا انْقَطَعَ التَّتَابُعُ بِغَيْرِ عُذْرٍ شَرْعِي، يَلْزَمُ ابْتِدَاءُ الصِّيَامِ مِنْ جَدِيدٍ“۔

۲-(البحر الرائق، جلد 4، صفحہ 56):

”فِي كَفَّارَةِ الظِّهَارِ، لَا يَكْفِي إِلَّا صِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ، وَلَايَجُوزُ الزِّيَادَةُ عَلَى ذَلِكَ“۔

۳-(فتاوی عالمگیری، جلد 2، صفحہ 559):

”شَرْطُ التَّتَابُعِ فِي صَوْمِ شَهْرَيْنِ، وَإِنْ زَادَ عَلَى الشَّهْرَيْنِ لَايَكُونُ كَفَّارَةً إِلَّا بِتَتَابُعِهِمَا“۔

ان حوالہ جات سے واضح ہوتا ہے کہ ظہار کے کفارے میں شریعت نے دو مہینے کے مسلسل روزے کی شرط رکھی ہے۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

ظہار کے بعد روزہ کی طاقت نہیں ہے اب کیا کرے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے

اپنی بیوی سے ظہار کیا اور وہ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے تب اس کو کیا کرنا چاہیے جس سے ظہار کا کفارہ ادا ہو سکے فقہ حنفی کی مستند کتابوں کے حوالے سے اس کا جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے ظہار کیا اور وہ دو مہینے کے مسلسل روزے رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے، تو فقہ حنفی کے مطابق اس پر ظہار کا دوسرا کفارہ واجب ہوگا، جو ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا ہے۔ اگر وہ شخص روزے رکھنے کے قابل نہ ہو، تو ساٹھ مساکین کو دو وقت کا پیٹ بھر کر کھانا کھلانا ضروری ہے۔ اگر کھانا کھلانے کی استطاعت بھی نہ ہو، تو جب تک وہ اس کفارے کو ادا نہ کرے، اس کے لیے بیوی سے ازدواجی تعلقات حرام رہیں گے۔

حوالہ جات:

۱-(الدر المختار مع رد المحتار، جلد 3، صفحہ 451):

"وَإِنْ كَانَ لَا يَسْتَطِيعُ الصِيَام فَعَلَيْهِ إِطْعَامُ سِنِينَ مِسْكِينًا كُلُّ وَاحِدٍ مُدًّا مِنْ غَالِبِ قُوتِ الْبَلَدِ"۔

۲-فتاوی عالمگیری، جلد 2، صفحہ 559):

"وَإِذَا كَانَ لَا يَقْدِرُ عَلَى الصِّيَامِ، فَعَلَيْهِ إِطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا، لِكُلِّ مِسْكِينٍ مُدًّ"۔

۳-البحر الرائق، جلد 4، صفحہ 56):

"فَإِذَا لَمْ يَسْتَطِعِ الصِّيَامَ، فَعَلَيْهِ إِطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا"۔

ان حوالہ جات سے واضح ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص روزے رکھنے سے قاصر ہو، تو اس پر ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا لازم ہے۔ اس کے بغیر بیوی سے تعلقات بحال کرنا جائز نہیں ہوگا۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

کفارۂ ظہار کے درمین جماع کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ زید نے اپنی بیوی سے ظہار کیا اور ظہار کے بعد کفارے کے طور پر دو مہینے کا روزہ رکھ رہا تھا اسی درمیان اس نے اپنی بیوی سے جماع کر لیا تو اس کا حکم کیا ہے؟ فقہ حنفی کی معتبر اور مستند کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

اگر زید نے اپنی بیوی سے ظہار کیا اور کفارے کے طور پر دو مہینے کے مسلسل روزے رکھ رہا تھا، لیکن اس دوران اس نے اپنی بیوی سے جماع کر لیا، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے روزے باطل ہو جائیں گے اور اب اسے دوبارہ سے مسلسل دو مہینے کے

روزے رکھنے ہوں گے۔ظہار کے کفارے کے دوران بیوی سے جماع کرنا منع ہے، اور ایسا کرنے سے کفارہ مکمل نہیں ہوتا۔

حوالہ جات:

۱-(الدر المختار مع رد المحتار، جلد 3، صفحہ 451):

"وَإِنْ وَقَعَ الْوَطْيِ فِي أَثْنَاءِ صَوْمٍ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ، انْقَطَعَ التَّتَابُعُ وَيَلْزَمُهُ ابْتِدَاءُ الصِّيَامِ مِنْ جَدِيد"۔

۲-(فتاوی عالمگیری جلد2، صفحہ 559):

"وَإِذَا جَامَعَ فِي أَثْنَاءِ الصِّيَامِ فَسَدَ الصَّوْمُ وَيَجِبُ عَلَيْهِ ابْتِدَاءُ الصِّيَامِ مِنْ جَدِيدٍ، لِأَنَّ التَّتَابِعَ شَرْطٌ فِي صِيَامِ الْكَفَّارَةِ"۔

۳-(البحر الرائق، جلد4، صفحہ 56):

"فَإِذَا جَامَعَ فِي أَثْنَاءِ صِيَامٍ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ، انْقَطَعَ التَّتَابُعُ وَيَلْزَمُهُ ابْتِدَاءُ الصِيَامِ مِنْ أَوَّلِ"۔

ان حوالہ جات سے ثابت ہوتا ہے کہ ظہار کے کفارے کے روزوں کے دوران بیوی سے جماع کرنا منع ہے، اور اگر ایسا ہو جائے تو روزے دوبارہ سے مسلسل رکھنا لازم ہوگا۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

ظہار کا مفہوم، احکام، کفارہ کی تفصیلات

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ظہار کس کو کہتے ہیں اور اس کا حکم کیا ہے؟ اور اس کا کفارہ کیا ہے؟ ظہار کے بعد بیوی کس طرح حلال ہوسکتی ہے؟ تفصیل کے ساتھ فقہ حنفی کی معتبر و مستند کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

ظہار کی تعریف:

ظہار یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو اپنی ماں یا کسی اور محرم عورت کے کسی عضو سے تشبیہ دے، جیسے یہ کہنا کہ "تم میرے لیے ماں کی طرح ہو" یا "تمہاری پیٹھ میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے" وغیرہ۔

ظہار زمانہ جاہلیت میں ایک طلاق کی صورت سمجھی جاتی تھی، مگر اسلام نے اس کو طلاق نہیں قرار دیا، بلکہ ایک ناجائز اور مکروہ قول قرار دیتے ہوئے اس کے لیے کفارہ مقرر کیا۔

ظہار کا حکم:

ظہار ایک حرام اور ناجائز عمل ہے، جسے شریعت نے ناپسند کیا ہے۔ جو شخص اپنی

بیوی سے ظہار کرے، اس پر توبہ اور کفارہ لازم ہوتا ہے۔ ظہار کرنے کے بعد جب تک کفارہ ادا نہ کیا جائے، شوہر کے لیے بیوی کے ساتھ ازدواجی تعلقات حرام ہوتے ہیں۔

ظہار کا کفارہ:

۱- ظہار کا کفارہ قرآن مجید کی سورۃ المجادلہ میں واضح کیا گیا ہے مسلسل دو مہینے کے روزے رکھنا، بغیر کسی ناغہ کے۔

۲- اگر روزے رکھنے کی استطاعت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔

ظہار کے بعد بیوی کس طرح حلال ہو سکتی ہے؟

ظہار کرنے کے بعد جب شوہر کفارہ ادا کر لے گا، تو اس کے لیے اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات بحال کرنا جائز ہو جائے گا۔ کفارہ ادا کیے بغیر بیوی سے جسمانی تعلق حرام ہے۔

حوالہ جات:

۱- (الدر المختار مع رد المحتار، جلد 3، صفحہ 430):

"وَالشَّرْطُ فِي الظِّهَارِ أَنْ يَكُونَ الْمُشَبَّهُ بِهَا زَوْجَةً لَهُ، وَيَكُونَ اللَّفْظُ دَالًا عَلَى تَحْرِيمِهَا عَلَيْهِ كَالتَّشْبِيهِ بالظهرِ أَوْ غَيْرِهِ مِنْ أَعْضَاءِ الْأُمِّ"۔

۲- البحر الرائق، جلد 4، صفحہ 52):

"الظِّهَارُ حَرَامٌ وَيَجِبُ عَلَى مَنْ فَعَلَهُ الْكَفَّارَةُ، وَهِيَ صِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَيُطْعِمُ سِتِّينَ مِسْكِينا"۔

۳-فتاوی عالمگیری، جلد 2، صفحہ 560):

”وَإِذَا ظَاهَرَ مِنْ زَوْجَتِهِ فَلَا يَحِلُّ لَهُ أَنْ يَمَسَّهَا حَتَّى يُكَفِّرَ ، وَالْكَفَّارَةُ صِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَيُطْعَمُ سِتِّينَ مِسْكِينًا“۔

ان حوالہ جات سے واضح ہوتا ہے کہ ظہار ایک سنگین عمل ہے؟ جس کا کفارہ ادا کرنا ضروری ہے تا کہ شوہر کے لیے بیوی حلال ہو سکے۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿باب اللعان﴾

لعان کی تفصیل قرآن وحدیث کی روشنی میں

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں لعان کس کو کہتے ہیں اس کی تفصیل قرآن حدیث اور فقہ حنفی کی کتابوں میں کیا ہے، اس کو تفصیل سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیا

لعان کی تعریف:

فقہ کی اصطلاح میں لعان اس عمل کو کہتے ہیں جس میں شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور اس کے پاس کوئی گواہ نہ ہو، یا وہ اپنی بیوی کے حمل یا بچے کو اپنا نہ مانے۔ ایسی صورت میں شریعت نے لعان کا حکم دیا ہے، جس میں شوہر اور بیوی ایک دوسرے پر لعنت بھیجتے ہیں، اور اس کے بعد ان کے درمیان ہمیشہ کے لیے جدائی ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید میں لعان کا ذکر:

قرآن مجید کی سورۃ النور، آیات 6 تا 9 میں لعان کا ذکر موجود ہے:

"وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ إِنَّهُ لَمِنَ "الصَّادِقِينَ وَالْخَامِسَةُ أَنَّ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ وَيَدْرَأُ عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعَ" شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ إِنَّهُ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ وَالْخَامِسَةَ أَنَّ غَضَبَ اللهِ عَلَيْهَا إِنْ كَانَ مِنَ الصَّادِقِينَ"۔

(ترجمہ): اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگائیں اور ان کے پاس گواہ نہ ہوں سوائے ان کے اپنے، تو ان میں سے ہر ایک کی گواہی یہ ہے کہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھائے کہ وہ سچا ہے، اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اللہ کی لعنت اس پر ہو اگر وہ جھوٹا ہو۔ اور عورت پر سے عذاب اس وقت دور ہو سکتا ہے جب وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ (شوہر) جھوٹا ہے، اور پانچویں بار کہے کہ اللہ کا غضب اس پر ہو اگر وہ (شوہر) سچا ہو۔

حدیث میں لعان کا ذکر:

لعان کے مسئلے پر کئی احادیث موجود ہیں، جن میں نبی کریم ﷺ نے لعان کا حکم بیان فرمایا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کے پاس آ کر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگایا، اور پھر لعان کی آیات نازل ہوئیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کے درمیان لعان کروایا۔

فقہ حنفی کی کتابوں میں لعان کی تفصیل:

ا- (الدر المختار مع رد المحتار، جلد 3، صفحہ 451-452):

اَللِّعَانُ وَاجِبٌ إِذَا قَذَفَ زَوْجَتَهُ وَأَصَرَّ عَلَى ذَلِكَ وَلَمْ يُحْضِرْ شُهَدَاءَ أَرْبَعَةً، أَوْ نَفَى الْوَلَدَ فِي زَمَانِهِ۔

۲-(فتاوی عالمگیری، جلد2، صفحہ:550):

"وَإِذَا لَعَنَ الزَّوْجُ زَوْجَتَهُ وَكَانَتِ الشَّهَادَاتُ عَلَى مَا أَمَرَ اللهُ تَفَرَّقَا أَبَدًا، وَلَا يَجُوزُ بَعْدَ ذَلِكَ نِكَاحُهَا، وَيَنْتَفِي وَلَدُهُ عَنْهُ"۔

۳-(ہدایہ، جلد2، صفحہ 351):

" إِذَا قَذَفَ زَوْجَتَهُ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ بَيِّنَةٌ يُلْجَأُ إِلَى اللعَانِ، وَهُوَ أَنْ يَشْهَدَ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ إِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ"۔

لعان کا طریقۂ کار:

فقہ حنفی کے مطابق لعان کا طریقہ یہ ہے کہ قاضی کے سامنے شوہر چار مرتبہ گواہی دے کہ وہ سچا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹا ہو۔ پھر بیوی چار مرتبہ گواہی دے کہ شوہر جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اس پر اللہ کا غضب ہو اگر شوہر سچا ہو۔ اس کے بعد دونوں میں ہمیشہ کے لیے جدائی ہو جاتی ہے اور وہ دوبارہ کبھی بھی نکاح نہیں کر سکتے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

جن ملکوں میں قاضی نہیں وہاں لعان اور تفریق کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ جن ملکوں میں قاضی نہیں جیسے ہندوستان تو وہاں لعان کی کیا شکل ہوگی؟ اور تفریق کیسے ہوگی؟ فقہ حنفی کی معتبر و مستند کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی کی کتابوں میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ جہاں اسلامی قاضی موجود نہ ہو، وہاں لعان اور تفریق کی کیا صورت ہوگی۔ ایسی جگہوں پر اگر قاضی نہ ہو، تو معتبر مفتیان کرام یا علمائے دین اس ذمہ داری کو انجام دیں گے۔ وہ لعان کے شرائط اور کارروائی کو دیکھ کر شوہر اور بیوی کے درمیان تفریق کروا سکتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱- (الدر المختار مع رد المحتار (شامی):

"وفی بلاد لا قاضی فیها، یتولی التفریق علماء ذلک المکان" (رد المحتار، جلد 3، صفحہ 404)۔

۲- (البحر الرائق):

"وفی دیار لا قاضی فیها، یقوم العلماء مقام القاضی فی

التفريق بعد اللعان" (البحر الرائق، جلد4، صفحہ96)۔

۳-(فتاوی عالمگیری):

"**وإذا لم يكن في البلد قاضي، يتولى التفريق أهل العلم**" (فتاوی عالمگیری، جلد2، صفحہ537)۔

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں قاضی موجود نہ ہو، وہاں علمائے دین لعان کے بعد شوہر اور بیوی کے درمیان تفریق کا عمل انجام دیں گے۔ لہٰذا، ہندوستان جیسے ملکوں میں علمائے کرام لعان کی کارروائی کے بعد تفریق کرواسکتے ہیں۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

نابالغہ بچی کے لعان کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں ایک شخص کی بیوی ابھی نابالغہ ہے لیکن اس نے اپنی بیوی پر الزام لگاتے ہوئے کہا کہ تیرے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ میرا نہیں ہے تو اس صورت میں لعان ہوگا یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی کی کتابوں میں لعان کے شرائط میں سے یہ ہے کہ جس پر الزام لگایا جارہا ہے وہ عورت بالغہ ہو اور وہ ایسی ہو کہ جس کے حاملہ ہونے کا امکان ہو۔ نابالغہ

لڑکی کے بارے میں لعان نہیں ہوگا، کیونکہ نابالغہ لڑکی پر حمل کا امکان نہیں ہوتا۔ لہٰذا، اگر کسی شخص کی نابالغہ بیوی پر یہ الزام لگایا جائے کہ اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ اس کا نہیں، تو اس صورت میں لعان نہیں ہوگا۔

حوالہ جات:

۱-(الدر المختار مع رد المحتار (شامی)):

"ولا یجری اللعان إلا بین الزوجین البالغین، لأن الصغر مانع من الحمل" (رد المحتار، جلد 3 صفحہ 396)۔

۲-(فتاوی عالمگیری):

"وشرط اللعان کونها بالغة عاقلة، فلو کانت صغیرة أو مجنونة لم یجر اللعان" (فتاوی عالمگیری، جلد 2، صفحہ 536)۔

۳-(البحر الرائق):

"لا یجری اللعان إلا مع الزوجة البالغة لأن الصغری لاتحبل"

(البحر الرائق، جلد 4 صفحہ 94)۔

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ نابالغہ بیوی پر لعان جاری نہیں ہوتا، کیونکہ نابالغہ لڑکی کے حاملہ ہونے کا امکان نہیں ہے، جو لعان کے تحقق کے لیے ضروری ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

لعان کے بعد قاضی کی تفریق کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں اگر میاں بیوی کے درمیان لعان کے بعد قاضی نے دونوں دونوں کو الگ کر دیا تو یہ ہمیشہ کے لیے ہوگی یا کچھ دنوں کے لیے ہوگی؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں لعان کے بعد میاں بیوی کے درمیان تفریق کو ہمیشہ کے لیے قرار دیا گیا ہے۔ یعنی لعان کے بعد قاضی دونوں کے درمیان جدائی کرا دیتا ہے، اور اس کے بعد یہ دونوں کبھی بھی دوبارہ نکاح نہیں کر سکتے، چاہے دونوں راضی ہوں یا نہ ہوں۔ اس تفریق کے بعد ہمیشہ کے لیے ان پر حرمت مغلظہ قائم ہو جاتی ہے۔

حوالہ جات:

۱- فتاوی عالمگیری:

"وإذا تلاعنا فرق القاضي بينهما بنفسه، ولا يجوز لهما التراجع أبداً" (فتاوی عالمگیری، جلد 2، صفحہ 537)۔

۲- الدر المختار مع رد المحتار (شامی):

"وإذا وقع اللعان بينهما فرق القاضي بينهما، وحرمت عليه أبداً" (رد المحتار، جلد 3، صفحہ 404)۔

۳-ہدایہ:

"**وإذا تلاعنا فرق بينهما القاضي، وحرمت عليه أبداً**" (ہدایہ، جلد2،صفحہ 409)۔

ان عبارات سے واضح ہے کہ لعان کے بعد جو تفریق ہوتی ہے، وہ دائمی ہوتی ہے اور ان دونوں کے درمیان دوبارہ نکاح نہیں ہوسکتا۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿باب العدة﴾

عدت کا مفہوم، اوقات مدت کی تفصیلات

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ عدت کس کو کہتے ہیں؟ اور کب کب عدت گزارنی پڑتی ہے؟ اور عدت کی مدت کیا ہے؟ یہ ساری تفصیلات فقہ حنفی کی مستند و معتبر کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

عدت اس مدت کو کہتے ہیں جس میں عورت کے لیے نکاح یا شادی کرنا حرام ہوتا ہے اور یہ مدت مخصوص حالات میں لازم آتی ہے۔ عدت کے دوران عورت کو گھر میں رہنا، بناؤ سنگھار سے بچنا، اور سوگ منانا ضروری ہوتا ہے۔ عدت کا مقصد نکاح کے اثرات کو ختم کرنا اور رحم کی صفائی کی یقین دہانی ہے۔

عدت کن مواقع پر واجب ہوتی ہے؟

ا۔شوہر کے انتقال کی صورت میں:

اگر شوہر کا انتقال ہو جائے تو بیوی کو عدت گزارنا لازم ہے، خواہ نکاح کے

بعد رخصتی نہ ہوئی ہو۔

۲-طلاق کی صورت میں:

اگر شوہر بیوی کو طلاق دے دے تو عورت پر عدت گزارنا واجب ہے، بشرطیکہ خلوت صحیحہ ہو چکی ہو، یعنی شوہر اور بیوی کے درمیان ایسی تنہائی کا وقت ہو جس میں دونوں کے درمیان جسمانی تعلق قائم ہونا ممکن ہو۔

۳-خلع یا فسخ نکاح کی صورت میں:

اگر بیوی خلع لے یا نکاح فسخ ہو جائے تو بھی عدت واجب ہے۔

عدت کی مدت کیا ہے؟

۱-شوہر کے انتقال کی صورت میں:

بیوہ عورت کی عدت چار مہینے اور دس دن ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا“ (سورۃ البقرۃ:234)۔

۲-حاملہ عورت کی عدت:

حمل کی عدت بچے کی پیدائش تک ہے، خواہ شوہر کا انتقال ہو یا طلاق ہو،

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ" (سورۃ الطلاق:4)۔

۳-طلاق کی صورت میں عدت:

- حیض آنے والی عورت کی عدت: تین حیض (ماہواری) ہے۔

-حیض نہ آنے والی عورت کی عدت: اگر عورت کو حیض نہ آتا ہو، جیسے کم عمر بچی یا بڑی عمر کی عورت، تو اس کی عدت تین قمری مہینے ہے۔

حوالہ جات:

- الدر المختار مع رد المحتار (جلد 3، صفحہ 510-501)۔
- بدائع الصنائع (جلد 3، صفحہ 209-206)۔
- الفتاوی الہندیۃ (جلد 1، صفحہ 536-534)۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

شوہر کے انتقال کے چھ ماہ کے بعد بیوی کو اطلاع ملی، عدت کا کیا حکم ہے؟

سوال: ایک شخص کا انتقال ہو گیا لیکن اس کی خبر بیوی کو 6 ماہ کے بعد ملی تو اس کی عدت کا حکم کیا ہے؟ اس کی عدت پوری ہو گئی یا دوبارہ عدت گزارنی ہو گی؟

فقہ حنفی کی مستند و معتبر کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب و باللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں اگر کسی عورت کے شوہر کا انتقال ہو جائے اور اس کی خبر بیوی کو 6 ماہ بعد ملے تو اس کی عدت شوہر کی وفات کے وقت سے شمار کی جائے گی۔ یعنی عدت شوہر کی وفات سے شروع ہوگی نہ کہ خبر ملنے کے وقت سے۔

فقہ حنفی کی مستند کتب کے مطابق عدت وفات کی مدت چار مہینے اور دس دن ہے، اور یہ مدت شوہر کی وفات سے شمار کی جاتی ہے، چاہے بیوی کو خبر ملنے میں تاخیر ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا اگر چار ماہ دس دن کی عدت شوہر کی وفات کے وقت سے گزر چکی ہے تو عدت پوری ہوگئی، دوبارہ عدت گزارنے کی ضرورت نہیں ہے۔

فقہ حنفی کی کتاب ''الدر المختار مع رد المحتار'' میں اس مسئلے کی صراحت موجود ہے:

''ومن بلغها موت زوجها انقضت عدتها من يوم مات زوجها لا من يوم بلغها الخبر'' (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الطلاق، باب العدۃ، 3/559)۔

یعنی اگر کسی عورت کو شوہر کے انتقال کی خبر تاخیر سے ملے، تو اس کی عدت شوہر کی وفات کے دن سے شمار کی جائے گی، نہ کہ خبر ملنے کے دن سے۔

لہٰذا صورت مذکورہ میں اگر شوہر کی وفات کے بعد چار مہینے دس دن گزر چکے ہیں تو عدت پوری ہو چکی ہے اور دوبارہ عدت گزارنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

معتدہ عورت کا گھر سے نکلنے کا حکم

سـوال: معتدہ عورت اپنے گھر سے نکل سکتی ہے یا نہیں؟ فقہ حنفی کی کتابوں کے حوالے سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی کی کتابوں میں معتدہ عورت کے لیے عدت کے دوران گھر سے باہر نکلنے کی اجازت عمومی طور پر نہیں دی گئی ہے۔ معتدہ عورت پر لازم ہے کہ وہ عدت کی مدت پوری ہونے تک اپنے شوہر کے گھر میں رہے اور بلا ضرورت گھر سے باہر نہ نکلے، سوائے شرعی ضرورت کے۔

دلائل:

۱-الدر المختار (کتاب الطلاق، باب العدۃ):

اس کتاب میں صراحت ہے کہ معتدہ عورت کو عدت کے دوران کسی بھی غیر ضروری مقصد کے لیے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔

۲-رد المحتار علی الدر المختار (جلد 3، ص 560):

علامہ شامی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ عورت عدت کے دوران رات کے وقت کسی بھی حالت میں باہر نہ نکلے۔ البتہ دن کے وقت شدید ضرورت مثلاً کسبِ معاش کے لیے یا کوئی مجبوری درپیش ہو تو باہر نکلنے کی اجازت دی جا سکتی ہے، بشرطیکہ وہ فوراً واپس آ جائے۔

۳-بدائع الصنائع (جلد 2، ص 260):

امام کاسانی رحمہ اللہ نے وضاحت کی ہے کہ اگر کوئی معقول ضرورت یا شرعی حاجت ہو، مثلاً عدالت میں حاضری، تو ایسی صورت میں عورت کو عدت کے دوران گھر سے نکلنے کی اجازت ہو سکتی ہے۔

خلاصہ:

معتدہ عورت کے لیے عدت کے دوران گھر سے نکلنے کی عمومی اجازت نہیں ہے، مگر شرعی ضرورت اور مجبوری کی حالت میں اجازت ہو سکتی ہے، جیسے کمائی کے لیے جانا یا عدالت میں حاضری وغیرہ۔ ان صورتوں میں بھی ضروری ہے کہ عورت فوراً واپس آ جائے اور بلاوجہ باہر وقت نہ گزارے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

معتدہ کو ورثاء نے گھر سے نکال دیا، اب وہ کیا کرے؟

سوال: شوہر کا انتقال ہو گیا بیوی عدت میں ہے اور ورثاء نے اس کو گھر سے باہر نکال دیا تو معتدہ اب کیا کرے؟ فقہ حنفی کی معتبر کتابوں کے حوالے سے جواب مرحمت فرمائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

اگر شوہر کا انتقال ہو جائے اور بیوی عدت میں ہو تو شرعاً بیوی کے لیے

ضروری ہے کہ وہ اپنی عدت شوہر کے گھر میں گزارے، جیسا کہ فقہ حنفی کی معتبر کتب میں یہ حکم واضح طور پر موجود ہے۔ تاہم، اگر ورثاء نے اس کو شوہر کے گھر سے باہر نکال دیا ہے اور وہاں رہنا ممکن نہ ہو تو وہ کسی محفوظ جگہ پر عدت گزار سکتی ہے، جو جگہ اس کے لیے سب سے زیادہ محفوظ اور مناسب ہو۔

فقہ حنفی کی کتاب ''الدر المختار'' میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ عدت گزارنے والی عورت کو شوہر کے گھر میں ہی عدت گزارنی چاہیے، لیکن اگر وہاں رہنے کی اجازت نہ دی جائے یا کسی اور معقول عذر کی وجہ سے وہ وہاں نہ رہ سکے تو دوسری محفوظ جگہ پر عدت گزار سکتی ہے۔

حوالہ جات:

۱-الدر المختار مع رد المحتار:

''ویجب علی المعتده من الوفاة أن تلزم منزلها الذی مات زوجها وهی فیه'' (جلد3، صفحہ 560)۔

۲-فتاویٰ شامی:

''إن لم یمکنها الإقامة فی بیت الزوجیة لسبب من الأسباب فلها أن تنتقل إلی محل آخر آمن'' (جلد3، صفحہ 561)

لہٰذا، اس صورت میں معتدہ کے لیے عدت کے دوران ایک محفوظ جگہ کا انتخاب کرنا ضروری ہے جہاں وہ اپنی عدت کے احکام پورے کر سکے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿باب النسب﴾

بچہ کی پیدائش کے بعد شوہر نے اپنا لڑکا ہونے سے انکار کر دیا؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ زید کی شادی تبسم سے ہوئی اور شادی کے بعد اللہ نے ایک لڑکا دیا لڑکے کی پیدائش کے بعد بچے کو دیکھ کر زید نے کہا یہ بچہ میرا نہیں ہے بلکہ کسی اور کا ہے تو اس صورت میں میاں بیوی کے درمیان لعان ہوگا یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ اگر شوہر اپنی بیوی پر یہ الزام لگانے کہ اس کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ اس کا نہیں بلکہ کسی اور کا ہے، تو ایسی صورت میں لعان کا حکم ہوگا۔ لعان اس وقت ہوتا ہے جب شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگانے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کی نفی کرے۔ اس صورت میں قاضی کے سامنے لعان کی کارروائی ہوگی، اور لعان کے بعد میاں بیوی میں تفریق ہو جائے گی۔

حوالہ جات:

۱-(الدر المختار مع رد المحتار (شامی):

"إذا نفى الزوج الولد وقال: ليس منی، وتلاعنا، فرق القاضی بينهما" (رد المحتار، جلد 3 صفحہ 398)۔

۲-(فتاوی عالمگیری):

"إذا قال الزوج لامرأته: هذا الولد ليس منی، يجری اللعان بينهما" (فتاوی عالمگیری جلد 2 صفحہ 536)۔

۳-(ہدایہ):

"إذا نفی الرجل ولده من امرأته وقال: ليس هو منی، جاز له اللعان" (ہدایہ، جلد 2، صفحہ 410)۔

ان عبارات سے واضح ہے کہ اگر شوہر اپنی بیوی کے بچے کی نفی کرے اور اسے اپنا نہ مانے، تو ایسی صورت میں لعان ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

دو بچے پیدا ہوئے، شوہر ایک کا انکار کر رہا ہے، کیا حکم ہے؟

سوال: ایک آدمی کی شادی ایک عورت سے ہوئی کچھ دنوں کے بعد اللہ نے دو بچے

دیے ان دونوں بچوں کو دیکھ کر شوہر پہلے بچے کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ میرا نہیں ہے اور دوسرے بچے کا اقرار کر رہا ہے یہ میرا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس صورتحال میں دونوں بچے اسی کے ہوں گے یا جس بچے کا اقرار کر رہا ہے وہی بچہ اس کا کہلائے گا؟ فقہ حنفی کی معتبر و مستند کتابوں کے حوالے سے جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے پیدا ہونے والے بچوں میں سے کسی ایک کا انکار کرتا ہے اور دوسرے کا اقرار کرتا ہے، تو فقہ حنفی کی رو سے دونوں بچے اس کے ہی سمجھے جائیں گے، بشرطیکہ نکاح کے بعد حمل کی مدت پوری ہوگئی ہو، یعنی حمل کم از کم چھ ماہ کا ہو اور زیادہ سے زیادہ دو سال کے اندر ہو۔

یہ اصول اس بنیاد پر ہے کہ نکاح صحیح کے بعد جو اولاد پیدا ہوتی ہے، شریعت نے اس کو شوہر کی طرف منسوب کیا ہے، جب تک کہ شوہر خود واضح اور معقول دلیل کے ساتھ اس کا انکار نہ کرے، مثلاً لعان کی صورت میں۔

فقہ حنفی کی معتبر کتب میں اس مسئلے کی وضاحت موجود ہے:

۱- الدر المختار مع رد المحتار میں ہے:

"إذا أتت المرأة بولد بعد ستة أشهر من النكاح يلحقه نسبه ويلزمه حكمه" (الدر المختار، کتاب الطلاق، باب اللعان)۔

۲- فتح القدیر میں ہے:

"كل ولد ولد على فراشه بعد إمكان العلوق منه يثبت النسب إليه، إلا إذا نفيه الزوج بلعان" (فتح القدیر، کتاب الطلاق، باب اللعان)۔

لہٰذا اس صورت میں دونوں بچے شوہر کے ہی مانے جائیں گے اور کسی ایک کا انکار شرعاً معتبر نہیں ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

مطلقہ عورت سے پیدا ہونے والے بچے کا حکم

سوال: مطلقہ عورت سے پیدا ہونے والا بچہ کب تک طالق کا مانا جا سکتا ہے؟ فقہ حنفی کی مستند کتابوں کے حوالے سے جواب چاہیے۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی کے مستند کتب کے مطابق، مطلقہ عورت سے پیدا ہونے والا بچہ اس وقت تک شوہر کی طرف منسوب ہوگا جب تک کہ ولادت عدت کے اندر یا عدت کے اختتام کے فوراً بعد ہو جائے، کیونکہ اس صورت میں شرعی طور پر یہ بچہ سابقہ شوہر کا مانا جائے گا۔

حوالہ جات:

۱- الدر المختار مع رد المحتار میں لکھا ہے:

"الولد للفراش وللعاهر الحجر" (الدر المختار، کتاب الطلاق)۔

یعنی بچہ اس شوہر کا مانا جائے گا جس کے بستر پر پیدا ہوا ہو، نہ کہ زنا کرنے والے کا۔

۲-الفتاویٰ الہندیہ میں مذکور ہے:

"وَلَدُ الْمُطَلَّقَةِ يُلْحَقُ بِالزَّوْجِ مَا دَامَتْ فِي الْعِدَّةِ، وَإِذَا انْقَضَتْ الْعِدَّةُ يُلْحَقُ إِذَا وُلِدَ فِي زَمَانٍ يُمْكِنُ أَنْ يَكُونَ مِنْهُ" (الفتاویٰ الہندیہ، کتاب الطلاق)۔

یعنی مطلقہ عورت کا بچہ شوہر کی طرف منسوب ہوگا جب تک وہ عدت میں ہے، اور عدت کے بعد بھی جب تک ایسا وقت ہو کہ یہ ممکن ہو کہ بچہ اسی شوہر کا ہو۔

لہٰذا، عدت کے دوران یا اس کے قریب بچے کی پیدائش کی صورت میں بچہ شوہر کا مانا جائے گا، اور اس کے بعد بچہ شوہر کی طرف منسوب نہیں ہوگا جب تک کہ شرعی طور پر اس کا ثبوت نہ ملے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

شوہر کے انتقال کے اٹھارہ ماہ کے بعد پیدا ہونے والے بچہ کا حکم

سوال: زید کا انتقال ہوگیا اس کے انتقال کے اٹھارہ مہینہ کے بعد ایک بچہ پیدا ہوا تو اس بچہ کی نسبت کس کی طرف کی جائیگی۔ فقہ حنفی کی مستند کتابوں کے حوالہ سے بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

زید کا انتقال ہونے کے بعد اگر اٹھارہ مہینے کے بعد بچہ پیدا ہوا ہے تو اس بچہ کی نسبت زید کی طرف نہیں کی جائے گی، بلکہ اس کو ولد الزنا شمار کیا جائے گا کیونکہ اسلامی شریعت کے مطابق شوہر کی وفات کے بعد زیادہ سے زیادہ چھ مہینے تک کا وقت ہے جس میں ولادت ہونے پر نسب شوہر کی طرف ثابت ہوگا۔ اس کے بعد جو ولادت ہوگی، اس کا نسب ثابت نہیں ہوگا۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں اس کی وضاحت موجود ہے، جیسا کہ:

۱- فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"ولو ولدت امرأة بعد موت زوجها لستة أشهر يلحق الولد به، وإن زاد فلا يلحق" (الفتاویٰ الھندیۃ، جلد ۱، صفحہ ۴۴۶)۔

۲- البحر الرائق میں بھی اس کی وضاحت ملتی ہے:

"وإن جاء ت به لأكثر من ستة أشهر من وقت الوفاة فلا يلحق النسب" (البحر الرائق، جلد 4، صفحہ 138)

لہٰذا زید کی وفات کے اٹھارہ مہینے بعد پیدا ہونے والے بچہ کا نسب زید سے ثابت نہیں ہوگا، بلکہ اس کو ولد الزنا شمار کیا جائے گا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

شادی کے پانچ ماہ کے بعد پیدا ہونے والے بچہ کا حکم

سوال: زید کا نکاح ہندہ سے جنوری کی ایک تاریخ کو ہوا اس کے بعد وہ رخصت ہو کر اپنے شوہر کے گھر گئی شوہر کے ساتھ رہنے لگی مئی کے اخیر میں یعنی پانچ مہینے کے بعد اس کے گھر بچہ پیدا ہوا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ بچہ ثابت النسب کہلائے گا یا نہیں؟ اور یہ زید کی اولاد کہلائے گی یا نہیں؟ فقہ حنفی کی معتبر و مستند کتابوں کے حوالے سے اس کا جواب بتلائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیا

فقہ حنفی کے مطابق، اگر نکاح کے بعد چھ مہینے یا اس سے زیادہ عرصہ گزرنے پر بچہ پیدا ہو، تو وہ بچہ والد کی طرف منسوب ہوگا اور ثابت النسب کہلائے گا۔ لیکن اگر بچہ چھ مہینے سے کم مدت میں پیدا ہو، تو اس کا نسب ثابت نہیں ہوگا، جب تک کہ شوہر اس کا اقرار نہ کرے۔

آپ کے سوال میں ذکر کیا گیا کہ نکاح کے پانچ مہینے بعد بچہ پیدا ہوا ہے، اس لیے اس صورت میں بچہ ثابت النسب نہیں ہوگا جب تک کہ شوہر (زید) اس کا اقرار نہ کرے۔

اس مسئلے کے لیے فقہ حنفی کی معتبر کتابوں سے چند حوالہ جات درج ذیل ہیں:

۱- الدر المختار مع رد المحتار (شامی):

"وأقل مدة الحمل ستة أشهر" (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب النکاح، باب

النسب، ج3، ص555)۔

۲-بدائع الصنائع (امام کاسانی رحمہ اللہ):

"وأما أقل مدة الحمل فستة أشهر لما ذكر الله تعالى في كتابه العزيز: ﴿وحمله وفصاله ثلاثون شهراً﴾" (الأحقاف:15)، (بدائع الصنائع، کتاب النکاح، ج4، ص72)۔

۳-فتح القدیر (امام ابن الہمام رحمہ اللہ):

"فأما أقل مدة الحمل فستة أشهر" (فتح القدیر، کتاب الطلاق، ج3، ص437)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

باب الحضانۃ

زوجین میں سے ایک کے مرتد ہونے کی صورت میں بچہ کس کو ملے گا؟

سوال: ایک شخص نے ایک عورت سے شادی اسلام کی حالت میں کی اس سے ایک بچہ بھی پیدا ہوا کچھ دنوں کے بعد دونوں میں سے ایک مرتد ہو گیا، وہ بچہ کس کا کہلائے گا؟ اور وہ بچہ مسلمان سمجھا جائے گا یا مرتد؟ جو مرتد ہوا ہے اس کو ملے گا یا جو مسلمان ہے اس کو ملے گا؟

جواب: الجواب حامدا ومصلیا

فقہ حنفی کی روشنی میں اگر ایک شخص اور ایک عورت نے اسلام کی حالت میں شادی کی اور اس سے بچہ پیدا ہوا، پھر بعد میں ان میں سے کوئی ایک مرتد ہو جائے، تو اس بچے کی حیثیت کی وضاحت مندرجہ ذیل ہے:

ا- بچے کی حیثیت:

بچہ جو اسلام کی حالت میں پیدا ہوا، وہ مسلمان سمجھا جائے گا، ارتداد والدین کی حالت سے بچے کی حالت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ بچہ پیدا ہونے کے وقت والدین

کے مسلمان ہونے کی بنیاد پر مسلمان کہلائے گا۔

۲- بچہ کس کو ملے گا:

بچے کی نگہداشت اور پرورش اسلامی اصولوں کے مطابق ہوگی جو والدین میں سے مسلمان ہے، بچے کی سرپرستی اور کفالت اسی کو ملے گی۔ مرتد شخص کو بچے کی کفالت کا حق نہیں ہوگا کیونکہ اسلام میں مرتد کو والدین کی حیثیت نہیں دی جاتی۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

۱- الفتاوی الہندیۃ:

"وإذا ولد الولد على إسلام لم يضر ردة والده" (الفتاوی الہندی، ج۱، ص۲۱۵)۔

۲- الدر المختار:

"ويعتبر النسب إلى الأب المسلم و يستمر ولد على إسلامية"

(الدر المختار، ج۲، ص:۱۶۱)۔

۳- الکتاب الخانیۃ:

"و إذا رد احدهما فالنكاح فاسد ولكن يعتبر النسب و الطفل على إسلام" (کتاب الخانیہ، ج۲، ص:۱۲۲)۔

یہ تمام اقتباسات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ بچے کی حیثیت والدین

کی حالت سے قطع نظر اسلامی ہوتی ہے اور بچے کی کفالت کا حق مسلمان والدین کے پاس ہوتا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

پرورش کا حق کس کو حاصل ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مفتیان عظام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں، زید نے اپنی بیوی کو طلاق دی، یا کسی بھی جھگڑے کی وجہ سے وہ الگ رہ رہے ہیں، یا باپ کا انتقال ہوگیا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس کے کم عمر لڑکے اور لڑکیاں کس کے پاس رہیں گے؟ ایک سے نو سال تک کا بچہ، اسی طرح ایک سے نو سال تک کی بچی کس کے پاس رہے گی؟ ماں کے پاس یا باپ کے پاس یا باپ نہیں ہے تو دادا کے پاس شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً

شرعاً حق پرورش ماں کو حاصل ہے، لڑکا ہو تو سات سال تک اور لڑکی ہو تو بالغ ہونے تک، لہذا بچے اور بچیاں کو مذکورہ عمر تک ماں کے پاس رکھا جائے گا اور اخراجات کی ذمہ داری باپ کی ہوگی، لیکن لڑکا سات سال کے بعد اور لڑکی بالغ ہونے کے بعد باپ کی پرورش میں ہوں گے اور اگر باپ کا انتقال ہوگیا ہو تو دادا کو پرورش کا

حق حاصل ہوگا۔

و إذا وقعت الفرقة بين الزوجين فالام احق بالولد و النفقة على الاب حتى يستغني فيأكل وحده و يشرب وحده و يلبس وحده والخصافؒ قدر الاستغناء بسبع سنين اعتبار اللغالب و عليه الفتوى وكذا في الكافي وغيره (ہدایہ۲/۴۱۵، باب حضانۃ الولد ومن احق بہ)۔

والام والجد احق بالجارية حتى تحيض لان بعد الاستغناء تحتاج إلى معرفة آداب النساء والمرأة اقدر على ذلک و بعد البلوغ تحتاج إلى التحصين وا لحفظ والاب فيه اقوى و ادى (ہدایہ۲/۴۱۵)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿باب النفقة﴾

خلع کے بعد بچوں کے اخراجات کا حکم

سوال: ایک عورت کا خلع ہوگیا اسکی تین بچیاں ہیں، ان بچیوں میں سے کوئی بچی باپ کیساتھ کسی بھی صورت میں رہنے کو تیار نہیں ہے جبکہ باپ رکھنے کو اپنی بچی کی حیثیت سے آمادہ ہے تو کیا لیکن وہ باپ کے پاس رہنے کو تیار نہیں؟
اس صورت میں بھی بچیوں کا نان ونفقہ پاپ ہی کے ذمہ ہوگا یا نہیں؟

جواب: خلع کی صورت میں بچیوں کی پرورش اور نان ونفقہ کا معاملہ شرعی نقطۂ نظر سے درج ذیل ہے:

نان ونفقہ:

بچیوں کا نان ونفقہ (کھانا، پینا، لباس، تعلیم وتربیت وغیرہ) باپ کے ذمہ ہی ہوگا، چاہے بچیاں اس کے ساتھ رہیں یا نہ رہیں۔ والد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کا مکمل خرچ برداشت کرے، کیوں کہ شریعت میں یہ ذمہ داری والد پر ہی عائد ہوتی ہے۔

پرورش اور رہائش:

اگر بچیاں باپ کے ساتھ رہنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور ان کی والدہ یا کوئی اور قریبی رشتہ دار ان کی پرورش کر رہا ہے تو بھی باپ پر ان کا نان ونفقہ لازم ہوگا، البتہ ایسی صورت میں کہ جب والدان کے اخراجات نہ اٹھا رہا ہو، ان کی والدہ یا دوسرا شخص جو ان کی پرورش کر رہا ہو، باپ سے خرچ کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

اس کے بارے میں فقہائے کرام کی تصریحات موجود ہیں اور اس کی رو سے باپ پر نان ونفقہ واجب ہے۔

۱-ہدایہ میں ہے:

"و یجب علی الأب نفقة أولاده الصغار الفقراء الذین لامال لھم " (الہدایہ کتاب النفقات جلد ۲، صفحہ ۲۹۶)۔

ترجمہ: باپ پر واجب ہے کہ وہ اپنے چھوٹے فقیر بچوں کا خرچ اٹھائے، جو خود مال کے مالک نہ ہوں۔

۲-الدر المختار میں ہے:

"یلزم الأب نفقة أولاده الصغار الفقراء" (الدر المختار کتاب النفقات، جلد ۳، صفحہ ۵۸۰)۔

ترجمہ: باپ پر اپنے چھوٹے فقیر بچوں کا نان ونفقہ لازم ہے۔

۳-فتاوی عالمگیری میں ہے:

”و تجب النفقة على الأب لأولاده الصغار والكبار إذا كانوا فقراء والعاجزين عن الكسب“ (فتاوی عالمگیری، کتاب النفقات، جلد ۱، صفحہ ۵۴۷)۔

ترجمہ: باپ پر اپنے چھوٹے اور بڑے بچوں کا نان ونفقہ واجب ہے، اگر وہ فقیر ہوں یا کمائی سے عاجز ہوں۔

یہ دلائل اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ فقہ حنفی کے مطابق بچیوں کا نان و نفقہ باپ کے ذمہ واجب ہے، چاہے وہ اس کے ساتھ رہیں یا نہ رہیں۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

ایک عورت لاولد ہے اس کا حکم

سوال: اس مسئلے کی وضاحت فرمائی جائے ایک عورت ہے جس کو ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے کہ اس کے اندر کچھ خرابی ہے جس کی وجہ کر اس کو اولاد نہیں ہوگی۔ تو کیا محض ڈاکٹر کے کہہ دینے سے شوہر اس کو طلاق یا دوسرا نکاح کر سکتا ہے؟ زوج عنین کی طرح عورت کو بھی علاج کا موقع دیا جائے گا؟ اگر دیا جائے گا تو کتنے دنوں تک اور اس صورت میں علاج کا خرچ اور ذمہ داری کس پر ہوگی، رہنمائی فرمائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیا

۱-طلاق کا مسئلہ:

محض ڈاکٹر کے کہنے پر کہ عورت بانجھ ہے، شوہر کے لیے اسے طلاق دینا یا دوسرا نکاح کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ طلاق کا معاملہ بہت سنگین ہے۔ اور اس میں عجلت نہیں کرنی چاہیے۔

۲-علاج کا موقع:

جس طرح مرد کے عنین ہونے کی صورت میں علاج کا موقع دیا جاتا ہے، اسی طرح عورت کو بھی علاج کا موقع دیا جائے گا۔ شریعت میں دونوں کے ساتھ مساوی سلوک کیا جاتا ہے۔

۳-علاج کی مدت:

علاج کی مدت کا تعین عام طور پر ایک سال تک کیا جاتا ہے۔ اگر ایک سال کے اندر عورت کا علاج ہو کر وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل ہو جائے تو نکاح باقی رہے گا۔

۴-علاج کا خرچ اور ذمہ داری:

علاج کا خرچ اور ذمہ داری شوہر پر ہوگی کیونکہ نکاح کے بعد عورت کے تمام جائز اخراجات شوہر کی ذمہ داری میں ہوتے ہیں۔

آپ کے مسئلے کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت کو بانجھ قرار دینے کے بعد بھی اسے طلاق دینا فوری طور پر جائز نہیں ہے بلکہ علاج کا موقع فراہم کرنا ضروری ہے اور اس کا خرچ شوہر کے ذمہ ہوگا۔ اگر علاج کے باوجود اولاد نہ ہو سکے تو شوہر شریعت کے مطابق طلاق دے سکتا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

بیوی کے نفقہ میں کونسی چیزیں داخل ہیں؟

سوال: بیوی کا نفقہ جو شوہر پر واجب ہے نفقے میں کون کون سی چیزیں داخل ہیں؟ اس کی تفصیل بتلائیں اور یہ بھی بتلائیں کہ اگر بیوی امیر ہو اور شوہر غریب ہو تو نفقہ کی ادائیگی میں کس کی حالت کا اعتبار ہوگا؟ فقط

جواب: الجواب حامداً و مصلیا

فقہ حنفی میں شوہر پر بیوی کے نفقے کا وجوب اس بنیاد پر ہے کہ بیوی شوہر کے نکاح میں ہے اور وہ اس کے حقوق کی ادائیگی کے لیے موجود ہے۔ نفقے میں درج ذیل چیزیں شامل ہیں:

ا- کھانا (طعام)

بیوی کے لیے روزانہ کا کھانا فراہم کرنا شوہر پر واجب ہے۔

۲- کپڑے (لباس)

بیوی کے موسم کے مطابق ضروری لباس فراہم کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے۔ یہ لباس مناسب مقدار میں ہونا چاہیے تاکہ وہ موسم سرما اور گرما دونوں میں آرام سے زندگی گزار سکے۔

۳- رہائش (مسکن)

بیوی کو ایک مناسب رہائش فراہم کرنا شوہر پر لازم ہے، جہاں وہ اپنی عزت وعصمت کی حفاظت کر سکے اور اس کی ضروریات پوری ہو سکیں۔

۴- دوائیں (علاج معالجہ)

اگر بیوی بیمار ہو جاتی ہے، تو اس کا علاج اور ضروری دوائیں فراہم کرنا بھی شوہر کے ذمے ہے۔

نفقے کی ادائیگی میں کس کی حالت کا اعتبار ہوگا؟

اگر شوہر غریب ہے اور بیوی امیر ہے تو نفقہ کی مقدار کا تعین شوہر کی مالی حالت کے مطابق کیا جائے گا، نہ کہ بیوی کی۔ اس لیے بیوی کا مالدار ہونا نفقے کی ادائیگی میں کوئی اثر نہیں ڈالے گا، کیونکہ شریعت میں شوہر کی مالی حالت کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱- الدر المختار مع رد المحتار (شامی):

”والنفقه تشمل الطعام والكسوة والمسكن وحقها واجب على الزوج بحسب حاله“ (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب النکاح، باب النفقات، ج3، ص576)۔

۲-بدائع الصنائع (امام کاسانی رحمہ اللہ):

”والنفقه ما يحتاج إليه الإنسان في معيشته، من الطعام والكسوة والمسكن وغيرها مما لا بد منه“ (بدائع الصنائع، کتاب النفقات، ج4، ص23)

۳-فتح القدیر (امام ابن الہمام رحمہ اللہ):

”والاعتبار في تقدير النفقه بحال الزوج لا بحال الزوجة“ (فتح القدیر، کتاب النفقات، ج3، ص454)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم
مفتی حبیب اللہ قاسمی

بیوی تین دن ہوٹل سے کھانے کا مطالبہ کرے، کیا حکم ہے؟

سوال: اگر بیوی شوہر سے یہ مطالبہ کرے کہ میں کھانا نہیں پکاؤں گی، کم از کم ہفتے میں تین دن کھانا ہوٹل سے کھلانا پڑے گا تو سوال یہ ہے کیا بیوی کا یہ مطالبہ درست ہے؟ اور شرعی اعتبار سے طعام یعنی کھانا جو بیوی کا شوہر کے ذمہ ہے اس میں یہ چیز داخل ہے یا نہیں؟ فقط

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

اگر بیوی یہ مطالبہ کرے کہ وہ کھانا نہیں پکائے گی اور شوہر کو ہفتے میں تین دن

ہوٹل سے کھانا کھلانا پڑے گا، تو یہ مطالبہ شرعاً درست نہیں ہے۔ فقہ حنفی کے مطابق بیوی پر کھانا پکانا لازم نہیں، لیکن عرف اور معاشرتی حالات کے اعتبار سے اکثر بیویاں اپنے گھروں میں کھانا پکاتی ہیں۔ بیوی کا شوہر سے اس طرح کا مطالبہ کہ ہوٹل سے کھانا لایا جائے، ضرورت کے بغیر درست نہیں۔

فقہ حنفی میں اس مسئلہ کے متعلق واضح ہدایت یہ ہے کہ شوہر کے ذمہ بیوی کے نفقہ میں کھانے کا انتظام شامل ہے، لیکن بیوی کو یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں کہ وہ مخصوص دنوں میں ہوٹل سے کھانا کھائے۔ اگر شوہر بیوی کو مناسب طریقہ سے گھر میں کھانا مہیا کر رہا ہے تو اس کا یہ مطالبہ شرعی لحاظ سے ناجائز ہے۔

کتب فقہ میں اس حوالے سے تفصیل ''بدائع الصنائع'' اور ''الدر المختار'' وغیرہ میں موجود ہے، جن میں شوہر پر بیوی کے حقوق اور نفقہ کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

''بدائع الصنائع'' میں اس حوالے سے موجود ہے:

"والنفقة تجب لها على الزوج بمقدار حاجتها من القوت"

(بدائع الصنائع، جلد 4، صفحہ 34)۔

لہٰذا، بیوی کا یہ مطالبہ شرعاً جائز نہیں کہ شوہر ہفتے میں مخصوص دنوں میں ہوٹل سے کھانا لائے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

گھریلو کام کاج سے بیوی کے انکار کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ میری بیوی یہ کہتی ہے کہ آپ کے گھر میں جھاڑو لگانا برتن دھونا کھانا پکانا میرے فرائض میں داخل نہیں ہے آپ اس کے لیے کوئی نوکرانی خادمہ رکھیں تو کیا بیوی کا یہ کہنا صحیح ہے؟ کیا میرے ذمے اس کام کے لیے نوکرانی رکھنا ضروری ہے؟ فقط

جواب: الجواب حامداً و مصلیا

بیوی پر شرعی لحاظ سے گھر کے کام کاج (جھاڑو لگانا، برتن دھونا، کھانا پکانا وغیرہ) کرنا لازم نہیں ہے۔ شریعت میں بیوی کی ذمہ داری شوہر کی اطاعت اور اس کی جائز باتوں کو ماننا ہے، لیکن گھریلو خدمت کرنا اس پر شرعاً فرض نہیں۔ تاہم اگر بیوی از خود ان کاموں کو انجام دے تو یہ احسان اور محبت کی علامت ہے، مگر اسے لازم نہیں کہا جا سکتا۔

فقہ حنفی میں صراحت کے ساتھ یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ شوہر پر بیوی کے نان ونفقہ کا انتظام کرنا لازم ہے، لیکن بیوی سے گھریلو کام کا مطالبہ کرنا شوہر کے لیے واجب نہیں ہے۔ البتہ عرف اور رواج کی بنیاد پر بعض اوقات ان امور کا حصہ بنتا ہے، لیکن اگر بیوی مطالبہ کرے کہ اس کے لیے خادمہ رکھی جائے، تو یہ شوہر کی مالی حیثیت پر منحصر ہوگا کہ وہ اس مطالبے کو پورا کر سکتا ہے یا نہیں۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں اس مسئلے کا ذکر اس طرح آیا ہے:

قال فی "الدر المختار": "وَلَا يَجِبُ عَلَيْهَا الْخِدْمَةُ بِالْقِيَاسِ

عَلَـى الْـإِجَارَةِ، فَإِنَّهَا لَا تَلْزَمُهَا لِأَنَّ الْعَقْدَ لِلاسْتِمْتَاعِ، وَقَدْ رَفَضَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ ذَلِكَ فِي حَقِّ الْحُرَّةِ" (الدر المختار، کتاب الحضانۃ، جلد 3، صفحہ 606)

یعنی بیوی پر گھریلو خدمت کرنا واجب نہیں، اس کا نکاح شوہر کو خدمت کے لیے نہیں بلکہ صحبت اور ہمبستری کے لیے ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

بالغ بچوں کی خدمت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے میں کہ میری شادی کو ایک کافی عرصہ ہو گیا ہے میرے چار پانچ بچے ہیں کسی کی عمر 10 سال کسی کی 15 سال کسی کی 18 سال کسی کی 20 سال ہے ان سب بچوں کے لیے کھانا پکانا ان بچوں کا کپڑا دھونا اور ان کی ضروریات کا اہتمام و انتظام کرنا کیا میری بیوی کے ذمہ ہے ; یا کس کے ذمے ہے؟ اس کے بارے میں قران حدیث اسلام کیا بتلاتا ہے؛ اور فقہ حنفی کی معتبر اور مستند کتابوں میں کیا ملتا ہے؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

اسلامی تعلیمات اور فقہ حنفیہ کے مطابق، بیوی پر اپنے شوہر یا بچوں کی خدمت فرض نہیں ہے، یعنی کھانا پکانا، کپڑے دھونا یا دیگر گھریلو خدمات شرعی طور پر اس

کے ذمے نہیں ہیں۔ یہ کام اگر وہ کرے تو اس کی طرف سے حسن سلوک اور احسان ہوگا، لیکن شرعاً اس پر لازم نہیں کیا جا سکتا۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں صراحتاً بیان کیا گیا ہے کہ عورت پر اپنے شوہر اور بچوں کی خدمت کرنا شرعاً واجب نہیں۔ درمختار میں ہے:

"لَيْسَ عَلَيْهَا خِدْمَةُ زَوْجِهَا وَلَا بَيْتِهِ" (درمختار، جلد 5، صفحہ 256)۔

اسی طرح ردالمحتار میں امام ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لَا يَلْزَمُهَا تَدْبِيرُ مَنْزِلِهِ وَالْخِدْمَةُ لَهُ" (ردالمحتار، جلد 5، صفحہ 257)

یہ واضح ہے کہ شوہر کے لیے ضروری ہے کہ وہ بیوی کا نفقہ یعنی کھانے پینے، رہائش اور لباس وغیرہ کا انتظام کرے، لیکن بیوی پر یہ لازم نہیں کہ وہ شوہر یا بچوں کی خدمت کرے۔ بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کی ذمہ داری والد پر ہے۔

بچوں کی دیکھ بھال، ان کا کھانا پینا اور ضروریات پوری کرنا والد کے ذمہ ہے، اور اگر بیوی اپنی خوشی سے یہ کام کرے تو یہ اس کا احسان ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

بیوی بسلری کے پانی کا مطالبہ کرے تو کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ میری بیوی مجھ سے کہتی ہے کہ

میں گھر کے واٹر پمپ کا پانی نہیں پیوں گی جبکہ وہ پانی بھی صاف ہے اس میں کوئی دقت نہیں ہے اس کے باوجود کہتی ہے کہ مجھ کو بسلری کا پانی چاہیے اور بوتل کا پانی چاہیے، تو اب سوال یہ ہے کہ کیا میرے ذمے باہر سے بسلری کا پانی خرید کر کے لا کر دینا ضروری ہے؟ شریعت اس بارے میں کیا کہتی ہے؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

شریعت کی رو سے شوہر پر بیوی کی بنیادی ضروریات اور نان ونفقہ کا انتظام کرنا واجب ہے۔ اس میں کھانے، پینے، لباس اور رہائش کی فراہمی شامل ہے۔ پانی کی فراہمی بھی اس نان ونفقہ کا حصہ ہے، لیکن جہاں تک پانی کی نوعیت کا سوال ہے، شریعت اس بات کی قید نہیں لگاتی کہ خاص قسم کا پانی مثلاً بوتل والا یا بسلری کا پانی ہی فراہم کیا جائے۔ اگر گھر کا پانی صاف اور پینے کے قابل ہے اور صحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا، تو بیوی پر لازم نہیں کہ وہ صرف بوتل والا پانی ہی پینے پر اصرار کرے۔

فقہاء نے بیان کیا ہے کہ شوہر کی ذمہ داری اتنی ہے کہ وہ بیوی کی بنیادی ضروریات کا معقول انتظام کرے، لیکن غیر ضروری اور اسراف کی چیزوں کی فراہمی شوہر پر واجب نہیں ہے۔ اس لیے اگر گھر کا پانی صاف ہے تو شرعاً شوہر پر بسلری یا کسی خاص قسم کا پانی خرید کر لانے کی ذمہ داری نہیں ہے۔

جیسا کہ ''فتح القدیر'' میں مذکور ہے:

''یجب علی الزوج أن ینفق علی زوجته بالمعروف، ولا یلزمه ما زاد علی الحاجات الضروریة من أنواع الطعام والشراب التی فیها

اِسراف" (فتح القدیر، جلد 4، صفحہ 186)۔

لہٰذا، بیوی کا یہ مطالبہ کہ وہ صرف بسلری یا بوتل کا پانی پیئے گی، شرعی طور پر درست نہیں، اور شوہر پر اس قسم کی فرمائش پوری کرنا لازم نہیں ہے، جب تک کہ پانی پینے کے قابل اور صاف ہو۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

بیوی اگر واشنگ مشین، مکسر اور اے سی کا مطالبہ کرے تو کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلے میں کہ میری بیوی مجھ سے مطالبہ کر رہی ہے کہ میرے روم میں اے سی لگا دو اور میں ہاتھ سے مصالحہ نہیں پیسوں گی، لہٰذا مکسر مشین مجھ کو خرید کے دو اور ہاتھ سے کپڑا نہیں دھوؤں گی کپڑا دھونے والی مشین خرید کے دو، تو سوال یہ ہے کہ کیا میرے ذمے بیوی کی ان خواہشات کو پورا کرنا ضروری ہے؟ اور کیا بیوی کا نان ونفقہ جو شوہر کے ذمے آتا ہے اس میں یہ داخل ہے؟ اسلام اور شریعت اس سلسلے میں کیا کہتی ہے؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

شریعتِ مطہرہ نے شوہر کے ذمے بیوی کے حقوق میں نان ونفقہ (خوراک،

لباس اور رہائش) کو لازم قرار دیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ" (سورۃ البقرہ:233)۔

فقہ حنفی کی کتابوں میں یہ صراحت موجود ہے کہ شوہر کے ذمے بیوی کو کھانے پینے، پہننے کے لباس اور رہائش کا انتظام کرنا ضروری ہے، مگر یہ اخراجات عموماً عرف کے مطابق ہونے چاہئیں، یعنی ہر علاقے اور معاشرت کے عرف کو ملحوظ رکھ کر شوہر سے ان چیزوں کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک عیش وعشرت اور آرام دہ چیزوں کا تعلق ہے جیسے اے سی، مکسر مشین اور کپڑا دھونے والی مشین وغیرہ، تو یہ شوہر کے ذمے لازم نہیں ہیں۔ شوہر پر صرف اتنا واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی کو وہ ضروریات مہیا کرے جو عرف عام کے مطابق اس کے مقام وحیثیت کے لائق ہوں۔ البتہ اگر شوہر اپنی خوشی سے یہ سہولتیں مہیا کر دے تو یہ احسان ہوگا۔

فقہ حنفی کی مستند کتاب ''الدر المختار'' میں نفقہ کی تعریف میں واضح کیا گیا ہے:

"النفقة هي الطعام والكسوة والسكنى" (الدر المختار، جلد3، صفحہ 570)۔

اسی طرح ''الفتاوی الہندیۃ'' میں بھی یہی بات بیان کی گئی ہے کہ شوہر کے ذمے ضروریاتِ زندگی کا بندوبست ہے، نہ کہ عیش وعشرت کے سامان کی فراہمی:

"والنفقة تجب بمقدار الحاجة لا بما يزيد على ذلك من الترف والرفاهية" (الفتاوی الہندیۃ، جلد1، صفحہ 540)۔

لہٰذا بیوی کے مطالبات جیسے اے سی، مکسر مشین، یا واشنگ مشین خریدنے کا مطالبہ شوہر کے ذمے فرض نہیں ہیں۔ شوہر پر فقط بیوی کی بنیادی ضروریات یعنی نان ونفقہ پورا کرنا واجب ہے۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

بیوی شوہر سے ماں باپ سے الگ رہنے کا مطالبہ کرے تو کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں زید کی شادی ہندہ سے ہوئی شادی کے بعد ماں باپ نے مشترکہ مکان میں ایک روم اس کو دے دیا کھانا پینا رہنا سہنا سب کچھ مشترکہ مکان میں ہے، لیکن ہندہ اپنے شوہر زید پر بار بار یہ دباؤ ڈال رہی ہے کہ میں اس مشترکہ مکان میں نہیں رہوں گی مجھ کو الگ مکان میں لے کر رہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا زید سے اس کی بیوی ھندہ کا مطالبہ شرعا درست ہے؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیا

اسلامی شریعت میں نکاح کے بعد شوہر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی بیوی کے لیے رہائش کا انتظام کرے۔ یہ رہائش ایسی ہونی چاہیے کہ جس میں بیوی

کو اطمینان و سکون حاصل ہو اور اس کی عزتِ نفس محفوظ رہے۔ فقہ حنفی میں اس کے لیے بنیادی اصول یہ ہے کہ بیوی کے لیے علیحدہ مکان کا انتظام کیا جائے، جہاں اس کی خلوت اور نجی زندگی متاثر نہ ہو۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں اس مسئلے کی وضاحت:

۱- الدر المختار میں ہے:

"وللزوجة أن تسأل زوجها بيتاً يخصها لا يشركها فيه أحد من أهله" (الدر المختار، کتاب النکاح، باب الحقوق الزوجین، ج5، ص166)۔

ترجمہ: "بیوی کا حق ہے کہ وہ اپنے شوہر سے الگ گھر کا مطالبہ کرے جس میں اس کے شوہر کے اہل خانہ میں سے کوئی شریک نہ ہو"۔

۲- الفتاویٰ الہندیہ میں اسی مضمون کی وضاحت اس طرح ہے:

"وليس لهم أن يسكنوها مع أهل البيت من أبويه أو غيرهم، إلا أن ترضى بذلك" (الفتاویٰ الہندیہ، کتاب النکاح، ج1، ص378)۔

ترجمہ: "شوہر کے ماں باپ یا دیگر اہل خانہ کے ساتھ رہنے پر بیوی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا، الا یہ کہ وہ رضامند ہو"۔

۳- مبسوط سرخسی میں بھی یہی حکم بیان کیا گیا ہے:

"ولا يجوز للزوج أن يجمع بين زوجته وأهله في مسكن واحد إلا برضاها" (المبسوط، کتاب النکاح، ج5، ص215)۔

ترجمہ: ’’شوہر کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنی بیوی اور اپنے اہل خانہ کو ایک ہی گھر میں جمع کرے، سوائے بیوی کی رضا کے‘‘۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں:

۱- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

’’عاشروهن بالمعروف‘‘ (النساء:19)۔

ترجمہ: ’’اور اپنی بیویوں کے ساتھ بھلائی کے ساتھ زندگی بسر کرو‘‘۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کی راحت اور سکون کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۲- حدیث شریف میں ہے:

’’خيركم خيركم لأهله، وأنا خيركم لأهلي‘‘ (ترمذی، کتاب المناقب)۔

ترجمہ: ’’تم میں سے بہترین وہ شخص ہے جو اپنے اہل خانہ کے لیے بہترین ہو، اور میں اپنے اہل خانہ کے لیے سب سے بہتر ہوں‘‘۔

خلاصہ یہ کہ شوہر پر لازم ہے کہ وہ اپنی بیوی کے لیے ایسی رہائش فراہم کرے جس میں اس کی عزت و آرام کا خیال رکھا گیا ہو۔ اگر مشترکہ مکان میں رہائش سے بیوی کو تکلیف یا خلوت میں خلل واقع ہو تو بیوی کا علیحدہ مکان کا مطالبہ شرعاً جائز ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

بیوی کے لئے شوہر کے ماں باپ کی خدمت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے میں کہ زید کی شادی ایک عورت سے ہوئی، شادی کے بعد سے اب تک وہ ہندوستان کے ماحول کے مطابق مشترکہ مکان میں رہتا ہے۔ ماں باپ اس کے بوڑھے ہو چکے ہیں، زید کے ماں باپ بھی اسی کے ساتھ اس مشترکہ مکان میں رہتے ہیں۔ زید کا کہنا ہے اپنی بیوی سے کہ تم میرے ماں باپ کی خدمت کرو، ان کے کپڑے دھو کر کے دو، ماں کا بدن دباؤ اور ان کے ساتھ زندگی گزارو۔ اب سوال یہ ہے کہ زید کی بیوی کے ذمہ زید کے ماں باپ کے ساتھ رہنا اور ان کی خدمت کرنا شرعاً ضروری ہے؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

زید کی بیوی کے لیے شرعاً زید کے ماں باپ کی خدمت کرنا ضروری نہیں ہے۔ شریعتِ مطہرہ میں بیوی پر صرف اپنے شوہر کی اطاعت اور اس کے حقوق پورا کرنے کی ذمہ داری ہے، لیکن شوہر کے ماں باپ کی خدمت کرنا اس کے ذمہ واجب یا فرض نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ اپنی خوشی اور رضا سے خدمت کرتی ہے تو یہ اس کی طرف سے حسنِ اخلاق اور احسان ہے، اور اس پر اسے اجر و ثواب ملے گا۔

فقہ حنفی کی معتبر کتب میں اس بات کی وضاحت ملتی ہے کہ عورت پر ساس سسر کی خدمت لازم نہیں ہے۔

الدر المختار میں ہے:

"ولا يجب عليها خدمة أم زوجها ولا أبيه ولا قرابته، بل هي على الزوج فقط" (الدر المختار مع رد المحتار، ج3،ص604)۔

یعنی: ''بیوی پر شوہر کی ماں، اس کے باپ، یا اس کے رشتہ داروں کی خدمت کرنا واجب نہیں ہے، بلکہ یہ خدمت شوہر پر ہی لازم ہے''۔

اسی طرح فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"ولا تجب عليها خدمة والديه ولا قرابته" (الفتاوی الہندیہ، ج1،ص575)۔

یعنی: ''بیوی پر شوہر کے والدین یا اس کے رشتہ داروں کی خدمت واجب نہیں ہے''۔

لہٰذا، زید کی بیوی کو شرعی طور پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ زید کے والدین کی خدمت کرے۔ یہ صرف ایک اخلاقی اور سماجی طور پر پسندیدہ عمل ہو سکتا ہے، لیکن شرعاً لازم نہیں۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

بیوی کے میکپ کے سامان کی فراہمی کا حکم

سوال: بیوی کے میکپ کے سامان کی فراہمی کا شوہر کے ذمہ ضروری ہے؟ اسلامی

شریعت کی روشنی میں رہبری فرمائیں، مہربانی ہوگی۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیا

فقہ حنفی میں شوہر پر بیوی کے نفقے کا واجب ہونا ایک معروف مسئلہ ہے۔ نفقہ میں بیوی کی بنیادی ضروریات شامل ہوتی ہیں جیسے کھانا، پینا، لباس، رہائش وغیرہ۔ اس کے علاوہ شوہر پر ضروری ہے کہ وہ بیوی کو اتنا لباس اور دیگر ضروری اشیاء مہیا کرے جو اس کے معاشرتی اور سماجی حیثیت کے مطابق ہو۔

رہی بات زیب و زینت اور آرائش و زیبائش کے سامان جیسے مہنگے کریم، پاوڈر، اور فیشن کے دیگر لوازمات کی، تو یہ اشیاء بیوی کے نفقہ میں شامل نہیں ہیں۔ شوہر کے ذمے صرف بنیادی ضروریات ہیں، جبکہ آرائش و زیبائش کے سامان کا مطالبہ شرعی طور پر واجب نہیں ہے۔ ہاں اگر شوہر اپنی خوشی اور رضامندی سے دینا چاہے تو دے سکتا ہے، لیکن اسے واجب نہیں کیا جا سکتا۔

فقہ حنفی کی مستند کتب میں یہ مسئلہ واضح ہے کہ نفقے میں وہ چیزیں شامل ہیں جو بیوی کی بنیادی ضرورتیں ہوں، نہ کہ آرائش و زیبائش کے فالتو سامان۔

جیسا کہ ''الدر المختار'' میں ہے:

''وَإِنَّمَا تَجِبُ النَّفَقَةُ لِلزَّوْجَةِ بِمَا يُحْتَاجُ إِلَيْهِ فِي الْمَأْكَلِ وَالْمَلْبَسِ وَالسُّكْنَى وَغَيْرِهَا مِمَّا يُعْتَادُ'' (الدر المختار مع رد المحتار، ج۳، ص۵۷۶)

خلاصہ یہ ہے کہ شوہر کے ذمے بیوی کی بنیادی ضروریات پوری کرنا فرض ہے

،لیکن مہنگے کاسمیٹکس اور آرائشی اشیاء کا مطالبہ پورا کرنا شوہر کے لیے واجب نہیں ہے۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

بیوی شوہر کے کہنے پر بھی شوہر کے پاس نہ جائے تو نفقہ واجب ہے یا نہیں؟

سوال: زید بمبئ میں رہتا ہے زید چاہتا ہے کہ ہندہ اس کی بیوی بمبئ اس کے پاس آجائے لیکن ہندہ اپنے ناتی پوتا کے ساتھ وقت گذارنے کو پسند کرتی ہے زید کے کہنے کے باوجود بمبئ نہیں جاتی جبکہ زید کو ہندہ کی خدمت کی بھی ضرورت ہے۔تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں کیا ہندہ کا نان و نفقہ زید کے ذمہ ضروری ہے یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

فقہ حنفی کی رو سے بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمہ واجب ہے بشرطیکہ بیوی شوہر کے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو اور شوہر کے حکم پر اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے۔اگر بیوی کسی شرعی عذر کے بغیر شوہر کی اطاعت نہ کرے اور اس کے ساتھ رہنے سے انکار کرے،تو اس صورت میں نان ونفقہ ساقط ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ" (سورۃ النساء:34)۔

ترجمہ: مرد عورتوں کے نگہبان ہیں اس وجہ سے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی اور اس وجہ سے کہ وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔

اسی طرح حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"المرأة راعية في بيت زوجها ومسؤولة عن رعيتها" (صحیح بخاری، کتاب النکاح)۔

ترجمہ: عورت اپنے شوہر کے گھر میں نگہبان ہے اور اپنی رعیت (یعنی شوہر اور بچوں) کے بارے میں جوابدہ ہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب 'الدر المختار' میں لکھا ہے:

"ولو نشزت لا نفقة لها، لأنها ممتنعة عن التسليم، والنفقة في مقابلة التسليم" (الدر المختار، جلد 3، صفحہ 571)۔

ترجمہ: اگر عورت شوہر کی نافرمان ہو جائے تو اس کے لیے نفقہ نہیں ہے، کیونکہ وہ شوہر کے حوالے ہونے سے انکار کر رہی ہے، اور نفقہ شوہر کے ساتھ رہنے کے بدلے میں واجب ہوتا ہے۔

پس، مذکورہ صورت میں جب کہ ہندہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنے سے بلا شرعی عذر انکار کر رہی ہے اور بمبئی آنے کو تیار نہیں ہے، تو اس صورت میں زید کے

ذمہ ہندہ کا نان ونفقہ واجب نہیں ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

نابالغہ بیوی کا نفقہ شوہر پر لازم ہے یا نہیں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ زید کی شادی ایک لڑکی سے ہوئی جو نابالغہ تھی لیکن گھر والوں نے کسی مصلحت کی وجہ سے نکاح کے بعد اس کو رخصت بھی کر دیا لیکن وہ لڑکی ابھی صحبت کے قابل نہیں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا نان ونفقہ زید کے ذمے واجب ہوگا یا نہیں؟ مستند ومعتبر فقہ حنفی کی کتابوں کے حوالے سے جواب بتلا کر ممنون ومشکور ہوں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیا

فقہ حنفی کے مطابق نابالغہ لڑکی کے ساتھ نکاح کے بعد اس کی رخصتی کر دینا ایک غیر معمولی صورت ہے، لیکن اس کے نان ونفقہ کے متعلق اصول یہی ہے کہ نفقہ اسی وقت شوہر پر واجب ہوگا جب عورت شوہر کے ساتھ رہائش پذیر ہو اور وہ شوہر کے حقوق زوجیت ادا کرنے کے قابل ہو۔ اگر نابالغہ لڑکی ابھی تک صحبت کے قابل نہیں ہے، تو اس صورت میں نفقہ شوہر پر واجب نہیں ہوگا، کیونکہ نفقہ کے وجوب کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ عورت شوہر کو اپنے آپ پر قابو دے اور صحبت کے قابل ہو۔

امام ابن ہمام لکھتے ہیں:

"لا یجب النفقة إذا کانت صغیرة غیر مسکنة زوجها" (فتح القدیر، جلد۴، صفحہ۲۴۷)۔

اس سے معلوم ہوا کہ نابالغہ اور صحبت کے قابل نہ ہونے کی حالت میں شوہر پر نفقہ واجب نہیں ہوتا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

بیوی بالغہ ہے شوہر نابالغ ہے، نفقہ کا کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے میں کہ 12 سال کے لڑکے کی شادی 18 سال کی لڑکی سے ہوگئی، اور جس سے شادی ہوئی وہ لڑکی رخصت ہوکر کے اس نابالغ لڑکے کے گھر بھی آ گئی لڑکی قابل صحبت ہے۔ لیکن لڑکا بالغ نہ ہونے کی وجہ سے عمر کی کمی کی وجہ سے بیوی کے حقوق ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں بالغہ بیوی کا نان ونفقہ نابالغ لڑکے پر واجب ہوتا ہے یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

شریعت اسلامیہ میں نفقہ (یعنی بیوی کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات زندگی کا خرچ) خاوند پر واجب ہوتا ہے جب عقد نکاح کے بعد بیوی اپنے شوہر کے گھر آ جائے اور شوہر اس کے ساتھ رہنے کے قابل ہو۔ نابالغ لڑکے کے بارے میں اگرچہ

نکاح شرعی طور پر درست ہے، مگر نابالغ ہونے کی وجہ سے وہ خود نفقہ فراہم کرنے کا شرعاً مکلّف نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس پر ابھی تک شرعی احکام بالغ ہونے کے بعد لاگو ہوں گے۔

فقہ حنفی کے مطابق نابالغ لڑکا جب تک بالغ نہ ہو، اس پر نان ونفقہ کی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن اگر اس کے ولی یا سرپرست کے پاس اتنی مالی استطاعت ہو تو وہ اس کی طرف سے نفقہ ادا کرسکتا ہے۔ بالغہ بیوی کا نفقہ بالغ شوہر کے ذمے ہوتا ہے، لیکن اگر شوہر نابالغ ہو تو یہ ذمہ داری اس وقت تک موقوف رہے گی جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے۔

علامہ کاسانی نے ''بدائع الصنائع'' میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی ہے:

''إذا كان الزوج صغيرا لا يجب عليه النفقة؛ لأنه لا مال له، ولا قدرة له على الكسب'' (بدائع الصنائع، جلد 4، صفحہ 24)۔

یعنی نابالغ شوہر پر نفقہ واجب نہیں ہوتا کیونکہ اس کے پاس مال نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ کسب کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

اسی طرح ''فتاویٰ ہندیہ'' میں بھی ذکر ہے:

''لا تجب النفقة على الزوج الصغير'' (فتاویٰ ہندیہ، جلد 1، صفحہ 565)۔

یعنی نابالغ شوہر پر نفقہ واجب نہیں ہوتا۔

لہٰذا، موجودہ صورت میں نابالغ لڑکے پر بیوی کا نان ونفقہ واجب نہیں ہوگا، تاہم جب وہ بالغ ہو جائے گا تو اس پر بیوی کے نان ونفقہ کی ذمہ داری عائد ہوگی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

میاں بیوی بالغ ہیں لیکن ابھی رخصتی باقی ہے تو نفقہ شوہر کے ذمہ ہے یا نہیں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے میں کہ ہندوستان میں ایک عام رواج ہے کہ لڑکا بالغ ہے اور لڑکی بھی بالغہ ہے دونوں کا نکاح کر دیا جاتا ہے، لیکن رخصتی دو سال کبھی تین سال کے بعد ہوتی ہے، اور وہ بالغہ لڑکی اپنی ماں کے گھر رہتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ نکاح تو ہو گیا البتہ رخصتی نہیں ہوئی ہے اور وہ لڑکی شوہر کے گھر نہیں گئی ہے اس صورت میں اس لڑکی کا نان ونفقہ یعنی ذاتی اخراجات کا بار اور بوجھ ماں باپ اٹھائیں گے؟ یا اس لڑکے کے ذمہ واجب ہوگا؟ جس سے اس کا نکاح ہو چکا ہے؟ تفصیل کے ساتھ فقہ حنفی کی مستند و معتبر کتابوں کے حوالے سے جواب سے نوازیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

اس مسئلہ کا جواب فقہ حنفی کی روشنی میں یہ ہے کہ جب نکاح منعقد ہو چکا ہو اور دونوں فریق بالغ ہوں تو نکاح کے بعد شوہر پر بیوی کا نان ونفقہ واجب ہو جاتا ہے، چاہے رخصتی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ نکاح کے بعد شوہر اپنی بیوی کا ذمہ دار قرار پاتا ہے اور اس کے نان ونفقہ کا بار اس کے ذمہ لازم ہوتا ہے، بشرطیکہ بیوی شوہر کے پاس جانے سے انکار نہ کرے اور شوہر بھی بیوی کو ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہو۔

اگر شوہر رخصتی میں تاخیر کرتا ہے اور بیوی اپنے والدین کے گھر میں رہتی ہے، تو اس حالت میں بھی شوہر پر نان ونفقہ واجب ہے کیونکہ شرعاً نکاح کے بعد بیوی کی کفالت شوہر کے ذمہ ہو جاتی ہے۔

فقہی حوالہ جات:

۱- علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"تجب النفقة على الزوج بالعقد الصحيح إذا كانت الزوجة بالغة وقادرة على تسليم نفسها للزوج، ولاتشترط الرخصة لذلک"

(ردالمحتار، جلد 3، صفحہ 575)۔

۲- علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وإذا ثبت النكاح، وجبت النفقة على الزوج، سواء كانت الزوجة في بيت أهلها أو في بيت الزوج، مالم تكن ناشزة" (بدائع الصنائع، جلد4، صفحہ 34)۔

ان دونوں حوالوں سے واضح ہوتا ہے کہ بالغہ عورت کا نان ونفقہ نکاح کے بعد شوہر کے ذمہ واجب ہو جاتا ہے، چاہے وہ رخصتی کے بغیر والدین کے گھر میں رہتی ہو، جب تک کہ وہ شوہر کے گھر جانے سے انکار نہ کرے۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

نکاح کے بعد بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہے لیکن والدین اگر منع کریں تو کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے میں کہ ہندوستان میں ایک عام رواج ہے کہ لڑکا بالغ ہے اور لڑکی بھی بالغہ ہے دونوں کا نکاح کر دیا جاتا ہے، لیکن رخصتی دو سال کبھی تین سال کے بعد ہوتی ہے اور وہ بالغہ لڑکی اپنی ماں کے گھر رہتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ نکاح تو ہو گیا البتہ رخصتی نہیں ہوئی ہے اور وہ لڑکی شوہر کے گھر نہیں گئی ہے اس صورت میں اس لڑکی کا نان ونفقہ یعنی ذاتی اخراجات کا بار اور بوجھ ماں باپ اٹھائیں گے؟ یا اس لڑکے کے ذمہ واجب ہوگا؟ جس سے اس کا نکاح ہو چکا ہے؟ اگر لڑکا بیوی کا نان ونفقہ ادا نہ کرے خواہ از خود یا والدین کے دباؤ کی وجہ سے تو گنہگار ہوگا یا نہیں؟ اور اگر لڑکا دینا چاہے او والدین نہ دینے دیں تو والدین گنہگار رہوں گے یا نہیں؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

اس مسئلے میں فقہ حنفی کے اصول کے مطابق نکاح کے بعد بیوی کا نان ونفقہ شوہر کے ذمہ واجب ہو جاتا ہے، خواہ رخصتی ہو یا نہ ہو، بشرطیکہ بیوی خود کو شوہر کے سپرد کر دے اور شوہر کے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو۔ اگر بیوی اپنے والدین کے گھر رہ رہی ہو لیکن شوہر کے مطالبے پر آنے کے لیے تیار ہو اور شوہر اسے خود اپنے ساتھ

رکھنے پر آمادہ نہ ہو تو ایسی صورت میں شوہر پر بیوی کا نان ونفقہ لازم ہوگا۔

نان ونفقہ کے وجوب کے شرائط:

بیوی کا نفقہ اسی وقت واجب ہوتا ہے جب وہ شوہر کے گھر آ کر رہنے کے لیے تیار ہو اور شوہر اسے اپنے ساتھ رکھنے کی قدرت رکھتا ہو۔ اگر رخصتی میں تاخیر شوہر کی طرف سے ہے یا والدین کے دباؤ کی وجہ سے ہے، تو بھی نفقہ شوہر کے ذمہ واجب ہوگا۔ البتہ اگر بیوی خود رخصتی پر راضی نہ ہو یا بغیر عذر کے شوہر کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو تو نفقہ واجب نہیں ہوگا۔

لڑکے یا اس کے والدین کے گناہ کا حکم:

اگر شوہر بیوی کا نفقہ دینے سے قصداً انکار کرے تو وہ گناہگار ہوگا، کیونکہ نفقہ بیوی کا شرعی حق ہے۔ اور اگر والدین اپنے بیٹے کو نفقہ دینے سے روکتے ہیں، جبکہ بیٹا نفقہ دینا چاہتا ہو، تو والدین گناہگار ہوں گے۔ یہ بیوی کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی شمار ہوگی۔

فقہ حنفی کے مستند حوالہ جات:

امام کاسانیؒ لکھتے ہیں:

”وَيَجِبُ لَهَا عَلَى زَوْجِهَا النَّفَقَةُ وَالْكِسْوَةُ إِذَا سَلَّمَتْ نَفْسَهَا إِلَيْهِ وَإِنْ لَمْ يَدْخُلْ بِهَا، لِقَوْلِهِ تَعَالَى: وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ

وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ" (بدائع الصنائع، جلد 4، صفحہ 23)۔

اسی طرح "الدر المختار" میں ہے:

"وَمَتَى مَكَّنَتْ زَوْجَهَا مِنْ نَفْسِهَا يَجِبُ لَهَا النَّفَقَةُ وَإِنْ لَمْ تَسْكُنْ مَعَه" (الدر المختار مع رد المحتار، جلد 3، صفحہ 576)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿باب الأيمان﴾

قسم کو مضبوط کرنے کے لئے طلاق سے مربوط کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ زید و عمر کے درمیان ایک بات میں اختلاف ہو گیا، زید کہتا ہے یہ کام تم نے کیا ہے، عمر کہتا ہے میں نے نہیں کیا ہے۔ جب بات آگے بڑھی تو زید نے عمر سے کہا اگر تم یہ قسم کھالو کہ یہ کام نہ میں نے کیا ہے نہ میرے علم میں ہے کہ کس نے کیا ہے، اگر میں نے کیا ہو یا میرے علم میں ہو جس نے کیا ہے تو میری بیوی پر تین طلاق، تب میں مان جاؤں گا کہ تم نے یہ کام نہیں کیا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح قسم کھانا اور زید کا یہ کہنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اور اگر درست ہے تو کرنے یا علم میں ہونے کی صورت میں یہ کہنے پر عمر کی بیوی پر تین طلاق ہو واقع ہو گی یا نہیں؟ مدلل جواب سے نوازیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

(۱) صورت مسئولہ میں زید کا اس طرح قسم کھلانا شرعاً درست ہے، چونکہ قسم اللہ ہی کی کھلائی جاتی ہے، البتہ اس قسم کو مضبوط کرنے کے لئے طلاق کو اس سے مربوط

کردیا گیا ہے۔

کما قال الشامی: والیمین بغیرہ مکروھة عند البعض للنھی الوارد فیھا، و عند عامتھم: لا تکرہ، لانھا یحصل بھا الوثیقة لا سیما فی زماننا و حملوا النھی علی الحلف بغیر اللہ لا علی وجہ الوثیقة بقولھم و ابیک و لعمرک و نحوہ فی الفتح و حاصلہ ان الیمین بغیرہ تعالیٰ تارة یحصل بھا الوثیقة ای اتثاق الخصم بصدق الحالف کالتعلیق بالطلاق والعتاق الی ان قال و إنما کانت الوثیقة اکثر من الحلف باللہ تعالیٰ فی زماننا لقلة المبالاة بالحنث و لزوم الکفارة أما التعلیق فیمتنع الحالف فیہ من الحنث خوفاً من وقوع الطلاق والعتاق (ردالمحتار، ج:۵، ص:۴۹۱، المکتبة الاشرفیة، دیوبند)۔

(۲) عمر کے کرنے یا علم میں ہونے کی صورت میں یہ کہنے پر عمر کی بیوی پر تین طلاق واقع ہوجائے گی، کیونکہ عمر کا یہ کہنا یمین غموس ہے اور یمین غموس کے ذریعہ طلاق واقع ہوجاتی ہے۔

کما قال الشامی: قولہ: (فیقع بھما) ای بالغموس واللغو إلی ان قال لا مواخذة فیھا الا فی ثلاث طلاق و عتاق ونذر اشباہ فیقع الطلاق علی غالب الظن إذا تبین خلافہ (ردالمحتار:۵/۴۹۲)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿باب الوقف﴾

وقف کا مفہوم، اقسام و شرعی حیثیت

سوال: وقف کے متعلق جامع مختصر مضمون ہو تو بھیجئے مہربانی ہوگی۔

جواب: الجواب حامداً ومصلیاً

وقف کا مفہوم اور اس کی اہمیت:

وقف عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی روکنا یا ٹھہرانا ہیں۔ شریعت میں وقف سے مراد کسی مال یا جائیداد کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے ہمیشہ کے لیے روک دینا ہے، تاکہ اس کا فائدہ مسلمانوں کو پہنچتا رہے۔ وقف کا اصل مقصد دنیاوی دولت کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خرچ کر کے آخرت کا سامان بنانا ہے۔

وقف کی شرعی حیثیت:

اسلام میں وقف ایک عظیم عبادت ہے جس کا اجر و ثواب مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ وقف کی حیثیت صدقہ جاریہ کی سی ہے، یعنی جب تک وقف شدہ مال یا جائیداد کا فائدہ پہنچتا رہے گا۔ اس کا ثواب جاری رہے گا۔

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل منقطع ہو جاتے ہیں، سوائے تین چیزوں کے صدقہ جاریہ، وہ علم جس سے نفع اٹھایا جائے، اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی رہے (صحیح مسلم)۔

وقف کی اقسام:

وقف کی کئی اقسام ہیں، جن میں سے چند اہم درج ذیل ہیں:

۱-وقف علی النفس:

ایسی وقف جائیداد جو وقف کرنے والے کے لیے وقف کی گئی ہو، لیکن بعد میں اس کا فائدہ عام لوگوں کو پہنچے۔

۲-وقف علی الذریۃ:

ایسی وقف جائیداد جو وقف کرنے والے کی اولاد اور نسل کے لیے وقف کی گئی ہو، لیکن اس میں سے ایک حصہ فقراء اور مساکین کے لیے بھی مخصوص ہو۔

۳-وقف علی الخیرات:

ایسی وقف جائیداد جو صرف فقراء، مساکین، یتیموں اور دیگر محتاجوں کے لیے وقف کی گئی ہو۔

۴-وقف علی المساجد:

ایسی وقف جائیداد جو مساجد، مدارس اور دیگر دینی مقاصد کے لئے وقف کی گئی ہو۔

وقف کے فوائد:

وقف کے بہت سے فوائد ہیں جو فرد اور معاشرے دونوں کے لیے ہیں:

۱-فلاحی کاموں کی ترغیب:

وقف کے ذریعے معاشرے کے غریب اور محتاج افراد کی مدد کی جاتی ہے، اور انہیں فلاح و بہبود کے کاموں میں شریک کیا جاتا ہے۔

۲-دینی تعلیم وتربیت:

وقف کے ذریعے مدارس، مساجد اور دینی اداروں کا قیام ہوتا ہے، جس سے دین کی تعلیم وتربیت عام ہوتی ہے۔

۳-موروثی مال کا استعمال:

وقف کے ذریعے موروثی مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جاتا ہے ہے، جس سے وہ مال اللہ کی رضا کے لیے استعمال ہوتا ہے اور دنیا وآخرت میں اس کا اجر ملتا ہے۔

وقف کے مسائل:

وقف کے مسائل شریعت میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ وقف کی جائیداد کو فروخت کرنا یا تبدیل کرنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ اس کی مصلحت ہو اور فقہاء کی اجازت کے ساتھ ہو۔ وقف کی دیکھ بھال اور انتظام کے لیے وقف نامہ (وقف نامہ) بنایا جاتا ہے، جس میں وقف کی شرائط اور احکام درج ہوتے ہیں۔

وقف کی حفاظت:

وقف شدہ جائیداد کی حفاظت اور اس کے صحیح استعمال کی ذمہ داری وقف کرنے والے یا اس کے متولی (منتظم) پر ہوتی ہے۔ اگر متولی وقف کی جائیداد میں خیانت کرے یا اسے ضائع کرے تو وہ شرعا گناہگار ہوگا، اور اسے اللہ کے حضور جوابدہ ہونا پڑے گا۔

خاتمہ:

وقف ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے دنیا و آخرت دونوں میں فلاح حاصل کی جاسکتی ہے۔ وقف کرنے والے کو چاہیے کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ اور اللہ کی رضا کے لیے وقف کرے تاکہ اس کا اجر دائمی ہو۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

وقف مشاع کا حکم

سوال: ایک عورت نے مشترکہ زمین میں سے اپنا حصہ ایک مسجد کو وقف کر دیا تا کہ اس کی آمدنی سے اس مسجد کی ضروریات کی تکمیل کی جاسکے، لیکن بعض علماء یہ کہہ رہے ہیں چونکہ اس عورت نے اپنے غیر منقسم حصہ کو وقف کیا ہے جو وقف مشاع کے دائرہ میں آتا ہے، اس لئے وقف درست نہیں ہے اور دیگر بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ وقف مشاع بھی درست ہے، لہٰذا وقف کرنے والی عورت کا وقف درست اور صحیح ہے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان دونوں آراء میں سے کونسی رائے درست اور صحیح ہے، اپنی تحقیق سے مطلع فرمائیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

راقم کی تحقیق کے مطابق ان حضرات علماء کا فتوی درست اور قابل عمل ہے جو اس وقف کی صحت کے قائل ہیں، لہٰذا عورت کا اپنے حصہ کا وقف کرنا درست ہے، یہ وقف اگرچہ وقف مشاع کے دائرہ میں آتا ہے، لیکن حضرت امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک وقف مشاع بھی صحیح اور درست ہے، اور حضرات متاخرین کے نزدیک مختار اور مفتی بہ قول حضرت امام ابو یوسف علیہ الرحمہ ہی کا ہے جس کی صراحت کتب فقہ میں مذکور ہے۔

فلا یجوز وقف مشاع یقسم خلافاً للثانی ...... واختلف

الترجیح والاخذ بقول الثانی احوط و أسهل" و فی "الدرر" و "صدر الشریعة" و به یفتی (الدرالمختار مع الرد ۶/۴۱۸۔۲۰م کتاب الوقف)و فی الشامی به افتی قاری الهدایة حیث قال: نعم تجوز القسمة و یفرز الوقف من الملک الخ (الشامی ۶/۲۵م کتاب الوقف مطلب (اذ اوقف کل نصف علیحدة)،(و ہکذا فی فتاوی دار العلوم، ج:۱۳، ص:۱۱۷)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

مسجد میں ٹرسٹی کی مداخلت کا حکم

سوال: کچھ لوگوں نے مل کر ہماری مسجد میں اصلاحی مجلس شروع کی لیکن دو مجلس ہونے کے بعد ٹرسٹی حضرات نے یہ کہہ کر مجلس بند کروادیا کہ بعد میں دیکھیں گے، حالانکہ بہت سارے نوجوان اس مجلس سے فائدہ اٹھارہے تھے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ٹرسٹیوں کو حق ہے کہ مسجد میں دین کی بات کرنے سے منع کردیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً:

اس میں شک نہیں کہ مسجد میں دین واسلام واصلاح مسلمین کے لئے کام کرنا محمود ہے، مذموم نہیں، لیکن مسجد کی انتظامیہ کمیٹی جس کی ذمہ داری مسجد کی بقاء وتحفظ کا

کام بھی ہے اور نشیب و فراز پر نظر رکھنا اور اس کے مطابق فیصلے لینا اس کی ذمہ داری ہے۔اس لئے مسجد کی کمیٹی کے ذمہ داران سے اس کے نفع ونقصان پر سنجیدگی سے بات کرلی جائے تو بہتر ہوگا۔

اس معاملہ کو فتوی کی نوک پر اچھالنے کے بجائے سنجیدگی سے کام لیا جائے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

قبرستان کے کچھ حصہ کو کرایہ پر دینے کا حکم

سوال: ایک قبرستان ہے اس کا کچھ حصہ پتھریلی ہے، وہ جگہ قبرستان بنانے کے کام میں نہیں آتی ہے، تو اس جگہ کو کرایہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟ جواب دے کر شکریہ کا موقع دیں۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

جو زمین قبرستان بنانے کے لئے وقف کی گئی ہے وہ زمین تا قیامت قبرستان کے لئے ہی رہے گی، اگر چہ وہ ویران ہوجائے یا اس پر پانی آجائے یا لوگوں کو اس کی ضرورت باقی نہ رہے۔

صورت مسئولہ میں جس پتھریلی زمین کی بات کی گئی ہے اس زمین کے کنکروں کو اٹھا کر مٹی ڈال دیا جائے تا کہ وہ زمین دفن کے لئے ہموار ہوجائے، یہ بھی

اگر ممکن نہ ہوتو اس پر قبرستان کے لئے کوئی گیٹ بنالیا جائے، یا قبرستان کے ساز و سامان کے لئے کوئی کمرہ بنا دیا جائے، لیکن بعض حصہ کے پتھریلی ہونے کی وجہ سے اس پر دکان بنانا درست نہیں ہے۔

سئل القاضی الامام شمس الائمہ محمود الاوزجندی عن مسجد لم یبق له قوم و خرب ماحوله واستغنی الناس عنه هل یجوز جعله مقبرة؟ قال: لا، و سئل هو ایضاً عن المقبرة فی القری إذا اندرست ولم یبق فیها اثر الموتی لا العظم ولا غیره هل یجوز زرعها و استغلالها؟ قال: لا، و لها حکم المقبرة (الفتاوی الہندیہ: ج:۵، ص:۴۷۰)۔

(۲) ارض لاهل قریة جعلوها مقبرة و اقبروا فیها ثم ان واحداً من أهل القریة بنی فیها بنائاً لوضع اللبن والات القبر واجلس فیها من یحفظ المتاع بغیر رضاء اهل القریة او رضا بعضهم بذلک قالوا: إن کان فی المقبرة سعة لایحتاج إلی ذلک المکان فلا بأس به و بعد ما بنی لواحتاجوا إلی ذلک المکان رفع البناء حتی یقبر فیه (کذافی فتاوی قاضی خاں)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

مسجد کے لئے موقوفہ زمین پر اسکول چلانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام درج ذیل مسئلہ کے بارے

میں: قصبہ نظام آباد محلّہ فرخ آباد میں زمین مسجد کے لئے وقف کی گئی تھی جس کی تعمیر مسجد کے طریقہ پر نہیں ہوئی بلکہ کچھ کمرے تعمیر ہوئے جن میں نماز ہوتی تھی اب اس زمین میں جو کمرے تعمیر ہوئے تھے ان میں بچے پڑھتے ہیں جس کو ایک صاحب اسکول کے نام سے چلا رہے ہیں اور وہ اس کا چندہ بھی کرتے ہیں، نیز اس میں پنجوقتہ نماز اب بھی ہوتی ہے اب پوچھنا یہ ہے کہ مسجد کے نام سے موقوفہ زمین میں اسکول چلانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں ہے تو مسجد کی کمیٹی اس سے کرایہ وصول کر سکتی ہے یا نہیں؟

(۲) زمین میں جو کمرے بنائے گئے ہیں ان کو ویسا ہی رہنے دیں یا مسجد کی شکل میں تعمیر کرنا چاہئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً

جو زمین مسجد کے لئے وقف کردی گئی تو اس زمین میں مسجد اور اس کے متعلقات کی تعمیر ہوسکتی ہے، دوسری چیزوں کی نہیں، صورت مسئولہ میں مسجد کی زمین پر تعمیر مسجد کی شکل و ہیئت پر نہیں ہوئی لیکن مسجد کی نیت سے یا اسکول کی نیت سے ہوئی ہو تو وہ تعمیر جائز نہیں اس کو توڑ کر مسجد اور اس کے متعلقات کی تعمیر ضروری ہے کیونکہ فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ واقف کے شرائط اور منشا کی رعایت ضروری ہے۔

اب رہا سوال کہ مسجد کی موقوفہ زمین پر اسکول چلانا کیسا ہے؟ تو فقہاء کرام نے مسجد میں دینی مکتب و دینی مدرسہ کے چلانے کی اجازت دی ہے، لیکن عصری وانگلش اسکول چلانے کی اجازت نہیں دی ہے کیونکہ مسجد کی زمین میں اسکول چلانے

کی صورت میں مختلف مفاسد اور فتنوں کا اندیشہ ہے اس لئے اس سے احتراز لازم ہے، البتہ مدرسہ چلانے والے ذمہ داروں پر ضروری ہے کہ مسجد کو کرایہ ادا کریں۔

۲-مسجد کی زمین پر جو کمرے بنائے گئے ہیں ان میں سے جو نماز کے لئے مستعمل ہیں ان کو مسجد کی شکل پر تعمیر کی جائے تا کہ لوگوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ یہ مسجد ہے اور آئندہ چل کر کسی قسم کا کوئی اشتباہ یا فتنہ وفساد پیدا نہ ہو کہ لوگ اس کے مسجد ہونے کا انکار کر دیں وغیرہ۔

مراعاة غرض الواقفين واجبة (شامی زکریا دیوبند ۶/۶۶۵)۔

شرط الواقف كنص الشارع فى وجوب العمل به و فى المفهوم و الدلالة (قواعد الفقہ ص:۸۵، قاعدہ ۱۵۲)۔

و يجوز الدرس فى المسجد و إن كان فيه استعمال اللبود والبوارى المسبلة لاجل المسجد (البحر الرائق کوئٹہ ۵/۲۵۰)۔

لايجوز لاحد ان يتصرف في ملك الغير بغير اذنه (قواعد الفقہ، ص ۱۱۰، قاعدہ ۲۷۰)۔

فالحاصل ان المساجد بنيت لاعمال الأخرة ولم تبن لاعمال الدنيا فما كان فيه نوع عبادة و ليس فيه اهانة و لا تلويث لايكره والا يكره الحلبى الكبير (سہیل اکیڈمی لاہور، ص:۶۱۰)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

قبرستان کی زمین میں عیدگاہ یا جامع مسجد بنانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ زمین قبرستان کے لئے وقف کی گئی تھی لیکن غیر مسلموں کے اعتراض کرنے کی وجہ سے اس زمین میں کوئی مردہ بھی دفن نہیں ہوا، اب پوچھنا یہ ہے کہ اس زمین پر عیدگاہ یا جامع مسجد بنا سکتے ہیں یا نہیں۔

الجواب و باللہ التوفیق:

موقوفہ قبرستان میں غیر مسلموں کے اعتراض کی وجہ سے کوئی مردہ دفن نہیں ہوا اور دفن کرنے کی صورت میں غیر مسلموں سے انتشار اور اختلافات کا خطرہ ہے، ایسی صورت حال میں قبرستان کمیٹی یا ذمہ داران کی اجازت سے اس قبرستان میں مسجد یا عیدگاہ کی تعمیر شرعاً جائز ودرست ہے، کیونکہ مسجد نبوی جس میں ریاض الجنۃ شامل ہے پرانے قبرستان پر تعمیر کی گئی ہے، نیز جس طرح قبرستان وقف ہوتا ہے اس سے اعلیٰ درجہ کا وقف مسجد وعیدگاہ ہوتی ہے، جس سے واقف کی غرض ومقاصد میں کوئی کمی نہیں آتی۔

لو إن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى قوم عليها مسجدا لم ار بذلک باساً (إلى قوله) فإذا درست و استغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد لان المسجد ايضاً وقف من اوقاف المسلمين (عمدۃ القاری، زکریا ۴۳۵/۳)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿کتاب البیوع﴾

مضاربت کی ایک صورت

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ایک صاحب ہیں جو اس وقت دبئ میں رہتے ہیں، اور وہ بہت سے کاروبار کرتے ہیں، جس میں سرفہرست ایک یہ بھی ہے کہ وہ گولڈ (سونا) ڈائمنڈ کا کاروبار کرتے ہیں، جس میں سونا خریدتے ہیں اوراس پر ڈیزائننگ کرکے مارکیٹ میں ہول سیل ریٹ پر فروخت کرتے ہیں، اب انہوں نے تقریبا چھ مہینے سے یہ کام شروع کیا ہے کہ وہ علماء کرام اور کمزور طبقے کے لوگوں سے بطور مضاربت کے پیسہ لیتے ہیں اوراس پیسے کو اپنے اسی سونے کے کاروبار میں لگاتے ہیں اور پھر جو منافع ہوتا ہے اس کا ستر (۷۰) فیصد رب المال کو دیتے ہیں، اور تیس فیصد خود رکھتے ہیں۔اوراس کی شکل یہ ہوتی کہ مثلاکسی نے ان کے کاروبار میں بیس (۲۰) ہزار لگائے تو اس رقم میں تقریبا چار سے پانچ ہزار ماہانہ نفع آتا ہے (جس کو وہ ہفتہ واری دیتے رہتے ہیں، کسی ہفتے ایک ہزار، کسی ہفتے گیارہ سو، کسی ہفتے بارہ سو، کسی ہفتے تیرہ سو، اور چاروں

ہفتے کا ملا کر تقریبا چار سے پانچ ہزار کے درمیان ہوجاتا ہے کمی زیادتی کے ساتھ) اور یہ معاملہ وہ اس وقت تک جاری رکھتے ہیں جب تک کہ نفع اصل رقم کے برابر نہ ہوجائے، جیسے ہی نفع اصل رقم کے برابر یا اس سے کچھ زیادہ ہوجاتا ہے (جس کی مدت تقریبا پانچ ماہ ہوتی ہے) تو وہ رأس المال یعنی مثلا بیس (۲۰) ہزار (جو بھی رقم لگائی تھی) رب المال کو واپس کر کے معاملہ ختم کر دیتے ہیں، پھر اگر کوئی دوبارہ یہ معاملہ کرنا چاہے تو از سر نو معاملہ کرسکتا ہے۔

اب معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا ایسے کاروبار میں مال لگانا شرعاً جائز ہے یا نہیں (قطع نظر اس کے کہ اس میں فراڈ ہونے کے بھی امکانات ہیں لیکن اصل مقصود جواز وعدم جواز کو معلوم کرنا ہے) برائے کرم مدلل ومفصل جواب سے نواز کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں عین نوازش ہوگی۔ فقط والسلام

جواب: الجواب حامداً ومصلیاً

مضاربت ایک ایسا معاہدہ ہے جس میں ایک فریق (رب المال) پیسے فراہم کرتا ہے اور دوسرا فریق (مضارب) اس پیسے سے کاروبار کرتا ہے۔ جو نفع حاصل ہوتا ہے، وہ متفقہ تناسب کے مطابق دونوں فریقوں کے درمیان تقسیم ہوتا ہے۔ مضاربت کے معاملے میں چند شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے تا کہ وہ شرعاً جائز ہو۔

نفع کی تقسیم کا تناسب:

۱- نفع کی تقسیم کا تناسب متعین اور شرعی ہونا چاہیے، مثلاً نصف، تہائی یا کوئی

اور متفقہ تناسب آپ نے بیان کیا کہ نفع کا ستر فیصد رب المال کو اور تیس فیصد مضارب کو دیا جاتا ہے، جو جائز ہے بشرطیکہ یہ تناسب متفقہ ہو۔

۲-اصل رقم کی واپسی:

مضاربت کے معاہدے میں اصل رقم کی واپسی کا کوئی التزام (گارنٹی) نہیں ہونا چاہیے۔یعنی اگر کاروبار میں نقصان ہو تو رب المال کو بھی نقصان برداشت کرنا ہوگا اور مضارب اپنی محنت کا معاوضہ نہیں لے گا۔اگر اصل رقم کی واپسی کی گارنٹی دی جائے تو یہ معاملہ قرض کے مشابہ ہو جائے گا جس میں نفع کی شرط سود (ربا) کی صورت اختیار کر لے گی، اور یہ شرعاً ناجائز ہے۔

نفع اور نقصان کی وضاحت:

مضاربت میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہونا ضروری ہے، اگر کاروبار میں نقصان ہو تو رب المال کو نقصان اٹھانا ہوگا اور مضارب کی محنت ضائع ہوگی۔

آپ نے جو صورت ذکر کی ہے اس میں جب نفع اصل رقم کے برابر ہو جاتا ہے تو رب المال کو اس کی اصل رقم واپس کر دی جاتی ہے۔اور معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ شرط درست نہیں کیونکہ مضاربت میں اصل رقم کی واپسی کی گارنٹی نہیں دی جاسکتی، اگر رب المال کو نقصان برداشت کرنے کا موقع نہ دیا جائے اور ہر حال میں اصل رقم واپس کی جائے، تو یہ شرعاً جائز نہیں ہوگا۔

لہٰذا مذکورہ صورت میں اگر اصل رقم کی واپسی کی گارنٹی دی جارہی ہے تو یہ مضاربت کا صحیح طریقہ نہیں ہے، اور یہ معاہدہ ناجائز ہوگا، تاہم اگر نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہو اور کوئی گارنٹی نہ ہو تو مضاربت جائز ہے۔

دلائل:

بدائع الصنائع میں ہے:

"وإذا تعاقدا على أن رأس المال مضمون فالصفقة فاسدة"

(بدائع الصنائع، جلد۵، صفحہ ۲۶۷)۔

بحرالرائق میں ہے:

"وأما إذا اشترط أن رأس الْمَالِ مَضْمُونَ فَتَفْسُدُ الْمُضَارَبَةُ"

(بحرالرائق، جلد ۷، صفحہ ۱۰۴)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

خیار عیب کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مفتیان عظام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں:

زید نے ایک بائک خریدی بکر سے بیس ہزار کی اور بکر نے زید سے کہا کہ گاڑی کلیر ہے فائنانس نہیں ہے، پھر زید نے گاڑی میں دو ہزار کا کام کرالیا بعد میں

جب گاڑی کا کارڈ چیک کرایا تو وہ گاڑی فائنانس والی تھی تو زید نے بکر سے کہا کہ آپ گاڑی واپس لو تو بکر نے گاڑی واپس لی مگر زید سے کہا کہ میں اٹھارہ ہزار روپئے واپس کروں گا اور بکر نے اٹھارہ ہزار روپئے واپس کرے، اس لئے کہ بکر نے کہا کہ تم نے ایک ہفتہ تقریباً گاڑی استعمال میں لی ہے اس کے کرائے کے طور پر پھر زید نے کہا میں نے گاڑی میں دو ہزار روپئے لگائے ہیں وہ بھی دو اور میرے بیس ہزار بھی دو، تو صورت مسئولہ میں بکر نے زید کو کل ۱۸؍ ہزار روپئے واپس کئے جبکہ گاڑی ۲۰؍ ہزار کی فروخت کی تھی، زید کو اور زید نے اسی گاڑی میں ۲؍ ہزار کا کام کرایا، بکر نے نہ تو بیس ہزار روپئے دیئے نہ وہ پیسے دیئے جو الگ سے زید نے لگائے گاڑی میں، کیا بکر کا یہ فعل جائز ہے جو اس نے پیسے بچائے، کیا وہ اس کے لئے حلال ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً

برتقدیر صحت سوال مسئولہ صورت میں بکر کے لئے ضروری ہے کہ بیس ہزار روپیہ نقد واپس کرے کیونکہ اس کی بائک میں عیب تھا جس کو انہوں نے زید سے چھپایا، ایسی صورت میں خریدار کو شرعاً خیار عیب ملتا ہے کہ اگر چاہے تو پوری قیمت کے عوض وہ چیز رکھے یا واپس کر دے اور بائع پوری قیمت واپس کرے، رہا یہ معاملہ کہ بائع اور مشتری دونوں ایک دوسرے سے جو مطالبہ کر رہے ہیں یعنی بائع کا کرایہ مانگنا اور مشتری کا گاڑی میں دو ہزار کا جو کام کرایا ہے وہ رقم مانگنا شرعاً درست نہیں ہے کیونکہ یہ فسخ بیع ہے اور فسخ پہلے ہی کے ثمن پر ہوتا ہے۔

و إذا اطلع المشتری علی عیب فی المبیع فھو بالخیار ان شاء

اخذه بجميع الثمن و ان شاء رده (ہدایہ ۳/۴۰، باب خیار العیب)۔

تصح بمثل الثمن الاول و بالسكوت عنه و يرد مثل المشروط ولو المقبوض اجود او ارد، (شامی مکتبہ اشرفی ۷/۳۴۹، کتاب البیوع باب الاقالہ)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

مبیع کی پوری رقم بائع کو دینے سے پہلے مشتری کا مبیع کو فروخت کرنے کا حکم

سوال: زید نے عمر سے ایک مکان ادھار خرید اتھوڑے پیسے دیے اور زیادہ پیسے دینے کے باقی ہیں، لیکن بہر حال سودا ہو چکا ہے اور زید نے بقیہ رقم چار مہینے مہینے تک دینے کی مہلت بھی لے لی ہے، لیکن اسی اثناء میں زید کو محسوس ہوا کہ میں بقیہ رقم نہیں دے سکوں گا تو کیا زید وہ مکان رفیق کو بیچ سکتا ہے؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

زید اگر مکان کا قبضہ حاصل کر چکا ہے تو وہ اس مکان کو رفیق کو فروخت کر سکتا ہے، چاہے بقیہ رقم ابھی ادا نہ کی گئی ہو۔ فقہ حنفی کے مطابق جب خریدار کو مال کا قبضہ مل جائے تو وہ اس مال کو آگے فروخت کر سکتا ہے۔ اس مسئلے کی وضاحت معتبر کتابوں میں اس طرح کی گئی ہے:

الدر المختار مع رد المحتار:

۱- یہاں بیان کیا گیا ہے کہ اگر کسی نے چیز ادھار خریدی ہو اور اس کا قبضہ لے لیا ہو، تو وہ چیز اس کی ملکیت میں آ جاتی ہے اور وہ اسے بیچ سکتا ہے۔

فتاوی عالمگیری:

۲- اس میں بھی ذکر ہے کہ قبضہ کے بعد خریدار کو مال فروخت کرنے کا اختیار ہوتا ہے، اگر چہ قیمت کا کچھ حصہ باقی ہو۔

لہذا، زید کے لیے مکان بیچنا جائز ہے بشرطیکہ اس نے مکان کا قبضہ لے لیا ہو۔ تاہم، زید پر لازم ہے کہ وہ مقررہ وقت پر عمر کو بقیہ رقم ادا کرے، استدراک اگر غیر منقولہ شئ ہو جیسے زمین مکان وغیرہ تو کیا اسے قبضہ سے پہلے بھی بیچ سکتے ہے؟ کسی نے ایک عبارت بھیجی ہے اس لئے سوال ذہن میں آیا۔

عبارت یہ ہے:

للمشتری ان یبیع المبیع لاخر قبل قبضه ان کان عقارا وان کان منقولا فلا.

فقہ حنفی کی مستند و معتبر کتابوں کے حوالے سے اس کا جواب بتلائیں۔

جواب: غیر منقولہ اشیاء جیسے زمین مکان وغیرہ کے بارے میں فقہ حنفی کے مطابق، ان کی خرید و فروخت قبضہ سے پہلے بھی جائز ہے۔ فقہ حنفی میں یہ اصول موجود ہے کہ اگر بیچی جانے والی چیز غیر منقولہ ہو، تو خریدار اسے قبضہ میں لینے سے پہلے بھی آگے بیچ سکتا ہے۔

عبارت کی وضاحت:

آپ نے جو عبارت نقل کی ہے:

للمشتری أن یبیع المبیع لاخر قبل قبضه ان کان عقاراً و ان کان منقولا فلا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بیچی جانے والی چیز غیر منقولہ (عقار) ہے، جیسے زمین یا مکان تو خریدار کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کا قبضہ لینے سے پہلے ہی آگے کسی اور کو بیچ دے۔ لیکن اگر چیز منقولہ (جیسے سامان، کپڑے وغیرہ) ہے، تو اسے قبضہ سے پہلے آگے بیچنا جائز نہیں۔

فقہ حنفی کی مستند کتابوں سے حوالے:

۱-الدر المختار مع رد المحتار (المعروف بہ شامی):

و یجوز بیع العقار قبل القبض لأنه لا یحتاج إلی النقل (رد المحتار علی الدر المختار، کتاب البیوع)۔

ترجمہ: ”عقار (زمین، مکان وغیرہ) کو قبضہ سے پہلے بیچنا جائز ہے، کیونکہ اسے نقل و حرکت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۲-بدائع الصنائع (کتاب البیوع):

امام کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **”لأن العقار لا یتعلق به حکم النقل، فصح بیعه قبل القبض“** (بدائع الصنائع، کتاب البیوع)۔

ترجمہ: ’’کیونکہ عقار (زمین مکان وغیرہ) کو نقل و حرکت کی ضرورت نہیں، اس لیے اسے قبضہ سے پہلے بیچنا جائز ہے۔

خلاصہ:

فقہ حنفی کے مطابق غیر منقولہ اشیاء زمین مکان وغیرہ کو قبضہ سے پہلے بھی بیچنا جائز ہے، جبکہ منقولہ اشیاء (جیسے سامان وغیرہ) کے بارے میں حکم یہ ہے کہ انہیں قبضہ سے پہلے بیچنا جائز نہیں ہے۔

فقط واللہ تعالی اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

کوئی شخص کوئی سامان لانے کو کہے اور مامور آمر سے خرید کردہ قیمت سے زیادہ وصول کرے تو کیا حکم ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ایک صاحب نے زید کو مدینہ سے کھجور لانے کے لئے کہا، زید عمرہ کے سفر پر تھا ظاہر سی بات ہے کہ مدینہ سے لے جانے میں کافی پریشانی ہوتی ہے یعنی سامان لے کر جانے میں، اب زید تجارت کی نیت سے اس کی قیمت بڑھا کر لے رہا ہے یعنی کھجور کی قیمت 400روپے ہے تو وہ 800 روپے لے رہا ہے تو کیا زید کا زائد رقم لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ زید

پہلے کھجور کی تجارت کرتا تھا اب نہیں کرتا ہےتو زائد رقم لینا کیسا ہے؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

صورت مسئولہ میں زید کا مدینہ سے کھجور لا کر اصل قیمت سے زیادہ وصول کرنا اس صورت میں جائز ہے جب وہ خریدار کو اضافی قیمت اور اپنے نفع کی وضاحت کردے، اور خریدار اس پر راضی ہو۔ شریعت میں بیع وشراء (خرید وفروخت) کے معاملات میں جب تک دھوکہ دہی، جھوٹ یا نقصان نہ ہو، نفع لینا جائز ہوتا ہے۔

دلائل اور حوالہ جات:

ا-عبارتِ فتاویٰ شامی:

"وَلَا بَأْسَ بِالزِّيَادَةِ فِي الثَّمَنِ عَلَى الثَّمَنِ الْأَصْلِيِّ إِذَا بَيَّنَ ذٰلِكَ لِلْمُشْتَرِي" (فتاویٰ شامی، جلد4، صفحہ 534)۔

ترجمہ: اگر بیچنے والا اصل قیمت پر اضافہ کرے اور خریدار کو اس کی وضاحت کردے، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

۲-الدر المختار:

"فِي الْبَيْعِ، لَا يَضُرُّ الزِّيَادَةُ فِي الثَّمَنِ مَا لَمْ يَكُنْ غَرَرٌ أَوْ خِدَاعٌ" (الدر المختار، کتاب البیوع)۔

ترجمہ: بیع (خرید وفروخت) میں قیمت میں اضافہ کرنا جائز ہے جب تک کہ اس میں کوئی دھوکہ یا فریب نہ ہو۔

لہذا، زید کا نفع لینا درست ہے، بشرطیکہ وہ قیمت میں اضافے کی وجہ اور نفع کی وضاحت کرے اور یہ سب کچھ شفاف طریقے سے ہو۔ اگر زید پہلے تجارت کرتا تھا یا نہیں کرتا تھا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا؛ اصل شرط شفافیت اور رضامندی ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

بٹ کوئن کے ذریعہ تجارت کا حکم

سوال: گذارش خدمت اینکہ بٹ کوئن کرنسی کے ذریعہ تجارت کرنا کیسا ہے؟ اور اس تجارت سے کمائے ہوئے روپیہ کا استعمال کرنا کیسا ہے؟

جواب: الجواب حامداً و مصلیا

بٹ کوائن (Bitcoin) اور دیگر کرپٹو کرنسیز کے ذریعے تجارت اور ان سے حاصل ہونے والے مال کے استعمال کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ فتاویٰ کی روشنی میں اس پر کچھ مختلف پہلوؤں سے غور کیا جاتا ہے، جن میں بنیادی شرعی اصول یہ ہیں:

ا- مال کا معیار:

فقہ حنفی کے مطابق مال کی تعریف ایسی چیز سے کی جاتی ہے جو "قابلِ تملیک" ہو، یعنی جسے انسان اپنی ملکیت میں لے سکے اور اس کا فائدہ حاصل کر سکے۔ چونکہ بٹ

کوائن کی کوئی ٹھوس وجود نہیں اور یہ مکمل طور پر ڈیجیٹل اور غیر محسوس چیز ہے، اس لیے بعض علماء اسے مال شمار نہیں کرتے اور اس کی خرید وفروخت کو جائز نہیں سمجھتے۔

۲-ضرر اور عدم استقرار:

بٹ کوائن اور دیگر کرپٹو کرنسیز کی قیمتوں میں انتہائی اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔
اسلامی فقہ میں غرر (غیر یقینی) اور جوئے کی ممانعت ہے، اور بٹ کوائن کی قیمت کی غیر یقینی صورتحال اور اس میں موجود شدید شک بعض علماء کے نزدیک اسے غیر شرعی بناتی ہے۔

۳-سرکاری اور حکومتی منظوری:

فقہ میں حکومت کی طرف سے منظور شدہ کرنسی کا استعمال بہتر سمجھا جاتا ہے۔
بہت سے ممالک میں بٹ کوائن کو باقاعدہ کرنسی نہیں مانا جاتا اور حکومتیں اس پر سخت قوانین لگا سکتی ہیں، اس لیے اس پہلو سے بھی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔

فقہ حنفی کے حوالہ جات:

فقہ حنفی کی مستند کتب میں موجود اصول کی روشنی میں، ہم غور کر سکتے ہیں کہ اگر کوئی چیز غیر یقینی یا مشکوک ہو اور اس میں غرر پایا جائے تو اس سے تجارت کرنا ممنوع ہے۔

۱-الدر المختار (جلد 5، صفحہ 228):

"وَلَا يَجُوزُ الْبَيْعُ بِمَا فِيهِ غَرَرٌ"۔

ترجمہ: جس چیز میں غرر (غیر یقینی) ہو، اس کی بیع جائز نہیں۔

۲-البحر الرائق (جلد 6، صفحہ 42):

"كُلُّ بَيْعٍ يَتَضَمَّنُ الْمُخَاطَرَةَ فَهُوَ مَمْنُوعٌ"۔

ترجمہ: ہر وہ بیع جو خطرے (شک) پر مشتمل ہو، وہ ممنوع ہے۔

۳-المبسوط للسرخسی (جلد 14، صفحہ 50):

"الغرر مجتنب في العقود المالية لأنه يؤدي إلى المنازعة والفساد"۔

ترجمہ: مالی عقود میں غرر سے بچنا واجب ہے کیونکہ یہ نزاع اور فساد کا سبب بنتا ہے۔

نتیجہ:

فقہ حنفی کے ان اصولوں کی روشنی میں بٹ کوائن کے ذریعے تجارت کرنے میں کئی فقہی مسائل پائے جاتے ہیں، جیسے غرر، عدم استقرار، اور مال ہونے کی تعریف کے مطابق اس کی حقیقت۔ لہٰذا، زیادہ تر حنفی علماء بٹ کوائن کے ذریعے تجارت کو یا تو ناجائز قرار دیتے ہیں یا کم از کم اس سے بچنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

جہاں تک اس تجارت سے کمائے ہوئے پیسے کا تعلق ہے، چونکہ اس میں شرعی اصولوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے، اس لیے اس مال کا استعمال بھی شرعاً درست نہیں ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

دیوالی کے موقع پر آفرز سے فائدہ اٹھانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں حضرات نے مفتیان کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں غیر مسلموں کے تہوار دیوالی وغیرہ کے موقع پر ان کی جانب سے مارکیٹ میں رکھے گئے آفرز سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی مسلمان کا ان مارکیٹ سے خریداری کرنا شرعا کیسا ہے؟ براہ کرم جواب عنایت فرمائیں جزاکم اللہ خیرا۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

غیر مسلموں کے تہوار جیسے دیوالی وغیرہ کے موقع پر مسلمان کا ان تہواروں سے متعلق خرید وفروخت یا آفرز سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں شرعی حکم جاننے کے لیے چند باتوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے:

۱- غیر مسلموں کے تہواروں میں شرکت:

اسلام میں مسلمانوں کو غیر اسلامی تہواروں میں شرکت اور ان کا حصہ بننے سے منع کیا گیا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ" (الفرقان:72)۔

مفسرین کے نزدیک "زور" سے مراد جھوٹے اور باطل کام ہیں، جن میں غیر مسلموں کے تہوار بھی شامل ہیں۔

۲-تہوار کی مناسبت سے خرید وفروخت:

اگر خرید وفروخت کا تعلق غیر مسلموں کے تہوار سے براہ راست نہ ہو اور یہ محض تجارتی معاملہ ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، جیسے اگر بازار میں عام اشیاء پر رعایت دی جارہی ہے اور اس رعایت کا تعلق صرف تجارتی فوائد سے ہے، نہ کہ تہوار کی ترویج سے، تو ایسی صورت میں خریداری کرنا جائز ہوگا۔ کیونکہ شریعت میں تجارت اور خرید وفروخت کو اصلاً جائز قرار دیا گیا ہے، بشرطیکہ حلال اشیاء ہوں اور خرید وفروخت کے مقصد میں کوئی شرعی ممنوعات شامل نہ ہوں۔

فقہ حنفی کے مراجع:

اس موضوع پر وضاحت کے ساتھ یہ بات ملتی ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ تجارت اور لین دین کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس میں دین کے خلاف کوئی کام نہ ہو۔

''حاشیہ ابن عابدین'' میں ایک مسئلہ کے تحت ذکر کیا گیا ہے:

"لا بأس ببيع المسلم و شراء من غير المسلم" (حاشیہ ابن عابدین، جلد 4، صفحہ 126)۔

یعنی مسلمان کا غیر مسلم سے خرید وفروخت کرنا جائز ہے، جب تک کہ وہ لین دین شریعت کے مخالف نہ ہو۔

خلاصہ یہ کہ اگر دیوالی یا کسی دوسرے غیر اسلامی تہوار کے موقع پر جو آفرز دی جارہی ہیں، ان کا مقصد تہوار کی ترویج نہیں بلکہ محض تجارتی مواقع ہیں اور ان سے

استفادہ کرنے والا مسلمان اس تہوار میں شامل نہیں ہو رہا ہو تو ان آفرز سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان کو غیر اسلامی تہواروں سے بچتے ہوئے اپنے دینی تشخص کو برقرار رکھنا چاہیے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

ثمیر گولڈ بزنس کا حکم

سوال: ثمیر گولڈ بزنس کا ایک اصول ہے جو کہ اس ہدایت نامہ میں درج ہے کہ

درمیان میں پیسہ واپس لینے پر دس فیصد سروس چارج کے طور پر کٹ جائیں گے اس کے بعد بقیہ پیسے واپس ملیں گے مثلاً کسی نے تیس ہزار لگایا تو درمیان میں وقت سے پہلے پیسے واپس لینے پر تین ہزار کاٹ کر ستائیس ہزار ملیں گے تو سوال یہ ہے کہ کیا ان کا اس طرح اصول بنانا اور دس فیصد کاٹنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ مدلل و مفصل جواب دے کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں عین نوازش ہوگی۔

جواب: الجواب حامداً و مصلیاً

آپ کا سوال ثمیر گولڈ بزنس کے ایک اصول کے متعلق ہے جس میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اگر کوئی وقت سے پہلے اپنے پیسے واپس لینا چاہے تو دس فیصد سروس چارج کے طور پر کاٹ کر بقیہ رقم واپس کی جائے گی۔ شرعی اعتبار سے اس مسئلے کا

جائزہ لیتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ شریعت نے تجارت میں عدل وانصاف اور شفافیت کو بہت اہمیت دی ہے۔ خرید وفروخت اور معاہدات کے بارے میں واضح اصول یہ ہے کہ کسی قسم کی شرط یا فیس جو کہ ناجائز طور پر مال حاصل کرنے کا ذریعہ بنے، وہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"**لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ**" (سنن ابن ماجہ، کتاب الاحکام، حدیث: 2340)۔

یعنی، "نہ خود نقصان پہنچاؤ اور نہ کسی کو نقصان پہنچنے دو"۔ اس حدیث کی روشنی میں، جب ایک معاہدے میں ایسی شرط رکھی جائے جو فریقِ ثانی کے لیے نقصان دہ ہو اور اس میں ناجائز فائدہ اٹھانے کی غرض ہو، تو وہ شرط غیر شرعی ہو جاتی ہے۔

اسی طرح، اگر کوئی کمپنی یا ادارہ سرمایہ کاری کے بعد سرمایہ کار کے پیسے کو وقت سے پہلے واپس لینے پر غیر معمولی فیس وصول کرتا ہے، تو یہ "عقدِ مضاربہ" یا "شرکت" کے اصولوں کے خلاف ہوگا، کیونکہ مضاربہ یا شرکت میں کسی فریق کے حق کو نقصان پہنچانے والی شرط لگانا شرعی طور پر درست نہیں ہے۔

فقہ حنفی کی کتاب 'الدر المختار' میں اسی قسم کی مثال ملتی ہے:

"**والشرط الذی فیه غرر أو ظلم یبطل العقد**" (الدر المختار، جلد 5، صفحہ 154)۔

یعنی، "ایسی شرط جو غرر (یعنی دھوکہ) یا ظلم پر مبنی ہو، وہ عقد کو باطل کر دیتی ہے"۔

اس اصول کے مطابق، ثمیر گولڈ بزنس کا دس فیصد رقم کاٹنے کا اصول اگر خدمات یا قانونی ضروریات کی مناسبت سے ہوتا تو الگ بات تھی، مگر یہاں بغیر کسی جائز وجہ کے ایسی کٹوتی شرعاً جائز نہیں ہوگی۔

لہٰذا، آپ کے سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح کا اصول جس میں سرمایہ کار کے حق میں واضح نقصان ہو، شرعی اصولوں کے مطابق درست نہیں ہے۔ کمپنی کو چاہیے کہ وہ شفاف اور عدل پر مبنی تجارت کے اصولوں کو اختیار کرے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

﴿باب الربا﴾

سودی رقم کے استعمال سے متعلق مختلف سوالات

سوال: کیا فرماتے ہیں حضرات مفتیان کرام مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں، میری ملازمت سعودی عرب میں تھی انڈیا کا جو شہری باہر کسی ملک میں ملازمت یا کسی بھی غرض سے موجود ہو اس کو بینک میں رقم ڈالنے کے لیے اکاونٹ کھولنا پڑتا ہے، میں نے اسٹیٹ بینک آف انڈیا میں اکاؤنٹ کھولا تھا، میری ملازمت کی تنخواہ اس میں آتی تھی، اس بینک کی طرف سے جو سود دیا جاتا تھا وہ ۱۳؍سال میں اس میں جمع ہو رہا تھا، سود کی رقم میں نے درج ذیل جگہوں پر خرچ کی:

۱- میں نے ایک زمین مکان تعمیر کرنے کے لیے خریدی تھی رجسٹریشن فیس پانچ لاکھ روپے تھی جو انٹرسٹ کی رقم سے ادا کی گئی۔ پھر چند سال بعد زمین پر مکان تعمیر کرتے وقت گورنمنٹ کے ایک ڈاکومنٹ کی ضرورت پڑی جس کو جاری کرانے کے لیے گورنمنٹ فیس چھ لاکھ روپیہ ادا کرنا پڑا، وہ بھی انٹرسٹ کی رقم سے ادا کی گئی، یہ سرکاری محکمے تک گئی، نیز کوٹ میں میرے خلاف اور زمین پر جو بے جا مقدمات

ڈالے گئے جبکہ درحقیقت یہ میری ملکیت تھی، عدالت کی جانب سے میرے حق میں فیصلہ بھی آ گیا اس ملکیت کی حفاظت کے لیے میں نے کوٹ میں ان کے خلاف لڑنے کے لیے جنہوں نے بڑی بڑی رقوم کا مطالبہ کیا اس لیے میں نے ان کو انٹرسٹ کے پیسوں سے رقم دی، نیز گورنمنٹ افسران سے کاغذ حاصل کرنے کے لیے رشوت کے طور پر وقتا فوقتا انٹرسٹ کی رقم دی گئی، اب سوال یہ ہے کہ انٹرسٹ کی رقم سے ان چیزوں کی ادائیگی درست ہے یا نہیں؟

سودی رقم کے مصارف

سوال: انٹرسٹ کی رقم سے درج ذیل مقاصد کے لیے ادائیگی کرنا، جیسا کہ زمین کی رجسٹریشن فیس، مکان کی تعمیر کے لیے گورنمنٹ ڈاکومنٹ فیس، عدالت میں مقدمات کی فیس، اور گورنمنٹ افسران کو رشوت دینا، کیا یہ درست ہے؟

جواب: فقہ حنفی کے مطابق سود (ربا) کا لینا اور دینا دونوں حرام ہیں، اور سود کی رقم کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ سود کی رقم کو صدقہ کر دینا چاہیے، لیکن اس سے صدقہ کرنے والا کوئی اجر و ثواب نہیں پائے گا کیونکہ سود حرام ہے۔

فقہ حنفی کی کتابوں میں سود کے استعمال کے بارے میں واضح ہدایات دی گئی ہیں۔

''الدر المختار'' اور ''رد المحتار'' (شامی):

۱- اس میں واضح طور پر ذکر ہے کہ سود کی رقم کو اپنے ذاتی مقاصد میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

"وأما الربا فإنه حرام مأكله، لا يجوز له أن يأخذهُ ولا يتصرف فيه بنفسه" (ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب البیوع، باب الربا)۔

فتاوی عالمگیری:

۲- یہاں بھی یہ بات مذکور ہے کہ سود کی رقم کو صدقہ کر دینا چاہیے۔

"ويتصدق به كله ولا يجوز له أن ينتفع به" (فتاوی عالمگیری، کتاب البیوع، باب الربا)۔

فتاوی محمودیہ:

۳- اس میں بھی سود کی رقم کے استعمال کے بارے میں واضح ہدایات دی گئی ہیں کہ اسے صدقہ کر دیا جائے اور ذاتی کاموں میں استعمال نہ کیا جائے۔

"إذا أخذ أحد الربا لا يَحِلُّ لَهُ أن يصرفه في نفسه وعليه أن يتصدق به كله" (فتاوی محمودی، کتاب البیوع، باب الربا)۔

"الدر المختار" اور "ردالمحتار" (شامی):

نتیجہ:

آپ کے ذکر کردہ مقاصد کے لیے سود کی رقم کا استعمال کرنا فقہ حنفی کے مطابق جائز نہیں ہے۔ سود کی رقم کو صدقہ کر دینا چاہیے، اور اسے ذاتی مفاد میں

استعمال کرنا حرام ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

مسجد کی زمین کی رجسٹری میں سودی رقم لگانے کا حکم

سوال: مسجد کی جگہ کی رجسٹریشن فیس سود (انٹرسٹ) کی رقم سے ادا کرنا، کیا یہ درست ہے؟ براہ کرم فقہ حنفی کی کتابوں کے حوالے سے جواب دیں۔

جواب: فقہ حنفی کے مطابق، سود کی رقم کا استعمال مسجد یا دیگر نیک مقاصد کے لیے کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ سود ایک ناپاک مال ہے اور اسے پاک کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسے بغیر کسی اجر وثواب کی نیت کے صدقہ کر دیا جائے، سود کی رقم کو نیک مقاصد میں استعمال کرنے سے وہ مقصد بھی ناپاک ہو جاتا ہے اور اس سے ناپاکی مسجد میں منتقل ہو جاتی ہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں اس حوالے سے درج ہے:

''الدر المختار'' اور ''رد المحتار'' (شامی):

۱- سود کی رقم کو نیک مقاصد، جیسے مسجد کی تعمیر یا اس کی رجسٹریشن میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

''لا یجوز أن یتصرف فیه في مصالح نفسه أو غیره'' (رد المحتار علی الدر المختار، کتاب البیوع، باب الربا)۔

فتاوی عالمگیری:

یہاں بھی یہ بات مذکور ہے کہ سود کی رقم کو صدقہ کر دینا چاہیے اور اسے کسی بھی مقصد میں استعمال نہیں کرنا چاہیے، چاہے وہ مقصد نیک ہو یا ذاتی۔

"ویتصدق به کله ولا یجوز له أن ینتفع به فی نفسه أو غیره"
(فتاوی عالمگیری، کتاب البیوع، باب الربا)۔

فتاوی دار العلوم دیوبند:

یہاں بھی سود کی رقم کے استعمال کے بارے میں یہی ہدایات دی گئی ہیں کہ اسے صدقہ کر دینا چاہیے اور نیک مقاصد میں بھی استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

"لا یجوز له أن یستفید منها فی شیء من الأشیاء، ویجب علیه أن یتصدق بها کلها" (فتاوی دار العلوم دیوبند، کتاب البیوع، باب الربا)۔

نتیجہ:

سود کی رقم سے مسجد کی جگہ کی رجسٹریشن فیس ادا کرنا فقہ حنفی کے مطابق جائز نہیں ہے۔ سود کی رقم کو صدقہ کر دینا چاہیے اور اسے کسی بھی نیک مقصد میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اگر رجسٹریشن فیس سود کی رقم سے ادا کی گئی ہے تو اس کی تلافی کے لیے مناسب اقدامات کیے جائیں اور آئندہ سودی معاملات سے بچنے کی کوشش کریں۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

سپر مارکیٹ سے ملنے والے پوائنٹس کو استعمال کرنے کا حکم

آج کل سپر مارکیٹ جب کوئی سامان خریدتا ہے تو سپر مارکیٹ کے جس کاؤنٹر پر بل بنتی ہے وہ اس خریدار سے فون نمبر پوچھ کر اپنے سسٹم میں خریدار کا اکاؤنٹ کھولتے ہیں۔ اب اس خریدار نے جتنے پیسوں کی خریداری کی ہوتی ہے اس پر بعد میں کچھ رقم سپر مارکیٹ کی طرف سے ڈال دی جاتی ہے۔ مثلاً سو روپے کی خریداری پر پانچ 10 روپے، اب اس رقم کو گاہک اگلی مرتبہ خریداری کے موقع پر جو بل بنتی ہے اس سے منہا کر لیتا ہے یا اسی طرح اکاونٹ میں چھوڑے رکھتا ہے۔

سوال: سوال یہ ہے کہ میں نے کوئی چیز خریدی اس پر جو بل بنی ہے اس میں جی ایس ٹی کی رقم مثلاً 100 روپے لگائی گئی ہے میں نے اتنی رقم انٹرسٹ میں سے نکال کر اصلی رقم میں شامل کر لی پھر سپر مارکیٹ کی طرف سے مثلاً 20 روپے سپر مارکیٹ میں بنائے گئے اکاونٹ میں آگئے تو یہ 20 روپے میں استعمال کر سکتا ہوں یا نہیں؟ یا اس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ جو 100 روپے بطور جی ایس کی ڈالے گئے تھے اسی کو بطور جی ایس ٹی جمع ہو گئے ہیں، لیکن بیس روپے واپس کر دیے گئے ہیں۔ لہذا مجھے اپنی اصلی رقم میں سے بیس روپے نکال کے دوبارہ انٹرسٹ کی رقم میں رکھنا ہو گا یا نہیں اس کی بھی وضاحت فرمائیے۔

سوال: سپر مارکیٹ سے خریداری کے بعد ملنے والے پوائنٹس اور جی ایس ٹی کی رقم انٹرسٹ سے ادا کرنے کی شرعی حیثیت؟

جواب: فقہ حنفی کے مطابق، سود کی رقم کا کسی بھی مقصد کے لیے استعمال جائز نہیں ہے، اور اسے کسی بھی نیک مقصد میں استعمال کرنا بھی ممنوع ہے، سود کی رقم کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے بغیر کسی اجر وثواب کی نیت کے صدقہ کر دیا جائے۔

آپ کے سوال میں دو باتیں ہیں:

۱- جی ایس ٹی کی رقم سود سے ادا کرنا۔

۲- سپر مارکیٹ کی طرف سے ملنے والے پوائنٹس یا رقم کا استعمال

جی ایس ٹی کی رقم سود سے ادا کرنا:

جی ایس ٹی کی رقم سود سے ادا کرنا فقہ حنفی کے مطابق جائز نہیں ہے۔ سود کی رقم کو کسی بھی قسم کی ادائیگی میں استعمال کرنا ممنوع ہے۔ یہ مسئلہ ''الدر المختار'' اور ''رد المحتار'' (شامی)، فتاوی عالمگیری، اور فتاوی دار العلوم دیوبند میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ سود کی رقم کو کسی بھی مقصد میں استعمال کرنا جائز نہیں۔

سپر مارکیٹ کی طرف سے ملنے والے پوائنٹس یا رقم کا استعمال:

۱- ''الدر المختار'' اور ''رد المحتار'' (شامی)

"من أخذ ربا أو دخل فی ماله حرام لا یجوز له أن یتصرف فیه إلا بطریقة الخیرات" (ردالمحتار علی الدر المختار کتاب البیوع، باب الربا)۔

۲-الفتاوی عالمگیری:

"لا یجوز له أن ینتفع بالربا فی نفسه أو غیره، ویجب أن یتصدق به" (فتاوی عالمگیری، کتاب البیوع، باب الربا)۔

۳-فتاوی دارالعلوم دیوبند:

"لایجوز للمسلم أن یستفید من الربا فی شئ من الأشیاء ویجب أن یتصدق به" (فتاوی دارالعلوم دیوبند، کتاب البیوع، باب الربا)۔

نتیجہ:

جی ایس ٹی کی رقم:

۱-آپ کو جی ایس ٹی کی رقم انٹرسٹ سے ادانہیں کرنی چاہیے۔انٹرسٹ کی رقم کوصدقہ کردینا چاہیے۔

سپر مارکیٹ کی طرف سے ملنے والے پوائنٹس:

۲- اگر سپر مارکیٹ کی طرف سے ملنے والے پوائنٹس یارقم کوئی انعامی شکل میں ہیں تو یہ جائز ہے۔تاہم،ان پوائنٹس کواستعمال کرنے کے بعداگرآپ کولگتا ہے

کہ ان پوائنٹس کی وجہ سے انٹرسٹ کی رقم کم ہوگئی ہے تو آپ کو اتنی رقم دوبارہ انٹرسٹ میں شامل نہیں کرنی چاہیے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

جی ایس ٹی میں سودی رقم دینے کا حکم

سوال: جی ایس ٹی کی مد میں ادا کی جانے والی رقم کو سود (انٹرسٹ) کی رقم سے ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ براہ کرم فقہ حنفی کی کتابوں کے حوالے سے مدلل جواب دیں۔

جواب: فقہ حنفی کے مطابق سود کی رقم کا کسی بھی مقصد کے لیے استعمال جائز نہیں ہے، چاہے وہ مقصد ٹیکس کی ادائیگی ہو یا کوئی اور معاملہ۔ سود ایک ناپاک مال ہے اور اس کا استعمال کسی بھی شکل میں ممنوع ہے۔ سود کی رقم کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے بغیر کسی اجر و ثواب کی نیت کے صدقہ کر دیا جائے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں اس حوالے سے درج ہے:

''الدر المختار'' اور ''رد المحتار'' (شامی):

سود کی رقم کو کسی بھی ذاتی یا عوامی مقصد میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

''لا یجوز أن یتصرف فیه في مصالح نفسه أو غیره'' (رد المحتار علی الدر المختار، کتاب البیوع، باب الربا)۔

فتاوی عالمگیری:

یہاں بھی یہ بات مذکور ہے کہ سود کی رقم کو صدقہ کر دینا چاہیے اور اسے کسی بھی مقصد میں استعمال نہیں کرنا چاہیے، چاہے وہ مقصد ٹیکس کی ادائیگی ہو یا کوئی اور۔

"ويتصدق به كله ولا يجوز له أن ينتفع به في نفسه أو غيره"

(فتاوی عالمگیری، کتاب البیوع، باب الربا)۔

فتاوی دار العلوم دیوبند:

یہاں بھی سود کی رقم کے استعمال کے بارے میں یہی ہدایات دی گئی ہیں کہ اسے صدقہ کر دینا چاہیے اور کسی بھی مقصد میں استعمال نہیں کرنا چاہیے، چاہے وہ مقصد ٹیکس کی ادائیگی ہو یا کوئی اور۔

"لا يجوز له أن يستفيد منها في شيء من الأشياء، ويجب عليه أن يتصدق بها كلها" (فتاوی دار العلوم دیوبند، کتاب البیوع، باب الربا)۔

نتیجہ: جی ایس ٹی کی مد میں ادا کی جانے والی رقم کو سود کی رقم سے ادا کرنا فقہ حنفی کے مطابق جائز نہیں ہے۔ سود کی رقم کو کسی بھی مقصد میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ سود کی رقم کو صدقہ کر دینا چاہیے اور اس سے کسی بھی قسم کا ذاتی یا عوامی فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

زمین اور مکان ٹیکس اور ناجائز مقدمات میں سودی رقم خرچ کرنے کا حکم

سوال: اسی طرح زمین کا ٹیکس اور مکان فیس جو سالانہ ادا کرنا ہوتا ہے اس میں سود کی رقم دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اور میرے خلاف میری ملکیت پر جو مقدمات درج ہیں ایک سالوں سے ہے سال دو سال میں کچھ نہ کچھ غاصبین کی طرف سے مقدمہ ڈال دیا جاتا ہے۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اس ملکیت کی خاطر جس کسی بھی کام پر انٹرسٹ کی رقم خرچ کی گئی ہے اس وجہ سے مجھے ان حالات ومسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، تو سوال یہ ہے کہ شریعت کے اعتبار سے مذکورہ بالا جگہوں پر انٹرسٹ کی رقم خرچ کرنا جائز تھا یا نہیں؟ اگر جائز نہیں تھا تو کیا یہ سب میرے ذمہ قرض ہے؟ جو مجھ کو جلد از جلد بغیر ثواب کی نیت کے ادا کرنا ہوگا، نیز کن افراد کو یہ رقم ادا کریں گے؟ اور کیا کہہ کر دیں گے؟

سوال: زمین کے ٹیکس مکان کی فیس اور مقدمات کی فیس کے لیے انٹرسٹ کی رقم کا استعمال کیا یہ جائز ہے؟ اگر نہیں تو کیا یہ قرض شمار ہوگا؟ اور اس رقم کو کہاں اور کیسے ادا کرنا چاہیے؟ براہ کرم فقہ حنفی کی کتابوں کے حوالے سے مدلل جواب دیں۔

جواب: فقہ حنفی کے مطابق سود (انٹرسٹ) کی رقم کا کسی بھی مقصد کے لیے استعمال

جائز نہیں ہے، چاہے وہ مقصد زمین کا ٹیکس ہو، مکان کی فیس ہو، یا مقدمات کی فیس ہو، سود ایک ناپاک مال ہے اور اس کا استعمال کسی بھی شکل میں ممنوع ہے۔

۱-زمین کا ٹیکس اور مکان کی فیس:

سود کی رقم کو ٹیکس اور فیس کے لیے استعمال کرنا فقہ حنفی کے مطابق جائز نہیں ہے۔

''الدر المختار'' اور ''رد المحتار'' (شامی)۔

''لا يجوز أن يتصرف فيه في مصالح نفسه أو غيره'' (رد المحتار علی الدر المختار، کتاب البیوع، باب الربا)۔

فتاوی عالمگیری:

''ويتصدق به كله ولا يجوز له أن ينتفع به في نفسه أو غيره''

(فتاوی عالمگیری، کتاب البیوع، باب الربا)۔

۲-مقدمات کی فیس:

مقدمات کی فیس کے لیے سود کی رقم کا استعمال بھی جائز نہیں ہے۔

فتاوی دار العلوم دیوبند:

''لا يجوز للمسلم أن يستفيد من الربا في شيء من الأشياء، ويجب أن يتصدق به'' (فتاوی دار العلوم دیوبند، کتاب البیوع، باب الربا)۔

نتیجہ:

۱-سود کی رقم کو کسی بھی مقصد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

۲- جو رقم سود سے خرچ کی گئی ہے، وہ آپ کے ذمہ قرض شمار ہوگی اور اسے آپ کو واپس کرنا ہوگا۔

۳-اس رقم کو بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کر دینا چاہیے۔

ادائیگی کی ترتیب:

قرض کی ادائیگی:

۱- جتنی رقم سود سے خرچ کی گئی ہے، اتنی رقم کو آپ اپنی حلال کمائی سے صدقہ کر دیں۔

صدقہ کے مستحقین:

۲- یہ رقم ان لوگوں کو دی جائے جو صدقہ کے مستحق ہیں، جیسے کہ فقیر، مسکین، یا دیگر مستحقین۔

فتاوی کی کتابوں کے حوالے:

۱-"الدر المختار" اور "ردالمحتار" (شامی)

"**لا يحوز أن يتصرف فيه في مصالح نفسه أو غيره**" (ردالمحتار علی

الدر المختار، کتاب البیوع، باب الربا)۔

۲-الفتاوی عالمگیری:

"ویتصدق به کله ولا یجوز له أن ینتفع به فی نفسه أو غیره" (فتاوی عالمگیری، کتاب البیوع، باب الربا)۔

۳-فتاوی دار العلوم دیوبند:

"لا یجوز للمسلم أن یستفید من الربا فی شیء من الأشیاء، ویجب أن یتصدق به" (فتاوی دار العلوم دیوبند، کتاب البیوع، باب الربا)

ادائیگی کا طریقہ:

۱-صدقہ کی نیت کے بغیر صرف یہ نیت کریں کہ آپ ایک ناپاک مال کو حلال طریقے سے نکال رہے ہیں۔

۲-مستحقین کو یہ بتادیں کہ یہ رقم سود کی ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

☆☆☆